دوسری مخلوق
(افسانے)
محمود ایوبی
ایڈشاٹ پبلی کیشنز بمبئی

دوسری مخلوق

دوسری مخلوق

(افسانے)

محمود ایوبی

کتاب : دوسری مخلوق

مصنف : محمود ایوبی

اشاعت اول : نومبر ۱۹۹۸ء

تعداد : پانچ سو (۵۰۰)

قیمت : -/RS.150 ـ /۱۵۰ ایک سوپچاس روپے،

زیر اہتمام : اطہر عزیز

کمپیوگرانی : صحر کمپیوٹرس، فورٹ، ممبئی

سرورق ڈیزائن : ریموس لبارڈ، آرٹ ڈائرکٹر، ایڈ شاٹ

ناشر : ایڈ شاٹ پبلی کیشنز
سانے بلڈنگ، دوسرا منزلہ، نانا بھائی لین،
فلورافاؤنٹین، ممبئی 400001
فون : 72 09 811 ,83 58 282 ,99 28 204

تقسیم کار :
- مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ممبئی، دہلی علی گڑھ
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی عزیزالدین وکیل، لال کنواں، دہلی
- ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولہ مارکیٹ، دریاگنج، دہلی ۱۱۰۰۰۲
- بک ایمپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

(اس کتاب کی اشاعت میں مہاراشٹر اردو اکادمی کا جزوی مالی تعاون شامل ہے)

نیو ایج پرنٹنگ پریس، پربھادیوی، ممبئی ۲۵ میں طبع ہوئی

اردو

پڑھنے والوں کے

نام

صفحات

ہم پہ جو گذری ہے ....

اس سے پہلے کہ آپ ہماری کہانیاں پڑھیں، میں آپ سے دو باتیں کرنا چاہوں گا۔

باتیں یہ ہیں کہ :

اپنے بہت سارے بھائیوں کی طرح اپنی بھی قطعی تاریخ پیدائش نہیں معلوم۔ بس موٹے موٹے حساب سے مارچ ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوا۔

آموں کے باغ سے گھرے ایک محلّہ اور انتہائی صابر و شاکر ماحول میں۔ دور نزدیک کے رشتہ دار زمیندار تھے مگر اپنا خانوادہ صوفیانہ تھا۔ بہت پہلے خاندان میں کوئی زندہ پیر گزرے تھے، مگر والد قانون کے پیشہ میں تھے۔ وہ ایک دردمند دل کے مالک اور حاضر دماغ اور بہت ہی بے نیاز آدمی تھے۔ جو حرص و ہوس سے بچنے اور سادگی اور قناعت کی زندگی بسر کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔

والد کی تلقین اور پھر صحابہ کرام اور بعض خلفاء کی ایماندارانہ معاشی اور اخلاقی جرأت مندی نے ایسا اثر ڈالا کہ آج تک دنیا کے پیچھے بھاگا اور نہ دنیاوی نقصانات یا عہدے و منصب کے چھوٹنے کا ملال ہوا۔

یہ جان کر کہ غزنہ میں اپنا ایک ہم نام بادشاہ گزرا تھا جو سومنات پر تابڑ توڑ حملے کر کے دولت سے مالا مال ہو گیا تھا۔ اپنا نام بالکل نہیں جچنے لگا۔۔۔ دوسرے مناسب اور موزوں نام کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ ایک نام بہت بھایا۔ محمد صلعم۔۔۔ والدہ سے مشورہ کیا تو وہ بگڑ اٹھیں اور سمجھایا کہ یہ مبارک نام اپنے پیغمبر صاحب کا ہے دوسرا کوئی یہ نام نہیں رکھ سکتا۔ ہاں ان کا نام لیوا ضرور بنے۔

حضور کی زندگی کے حالات نے بھی قلب و نظر پر خوب اثر ڈالا مگر عقل و شعور کا دامن چھوڑے بغیر۔ تاریخ و تحریک کے پس منظر میں ان کے کارناموں اور سیرت پر عاشق ہوں ۔

گوتم بدھ کے حالات سے بھی اس حد تک متاثر ہوا کہ اپنے یہاں کے خاموش اور

پُر سکون ماحول میں جہاں چڑیوں کی چہکار، ہواؤں کی سرسراہٹ اور پتوں کے ٹوٹ کر گرنے کی آواز بھی سنائی دیتی ہے دھونی رمایا کرتا تھا۔ توجہ اور ارتکاز کی کمی نے جس طرح بعد میں مارا اس وقت کے چونچال پن نے بھی نروان کی دولت سے محروم رکھا۔

والد روزی کی تلاش اور سماج سیوا میں بے حد مصروف رہتے تھے اس لئے ہم بھائیوں کی تعلیم کی طرف خود تو دھیان نہیں دے سکتے تھے ہاں کسی بھی ضعیف یا ضرورتمند آدمی کو سہارا دے کر ہم لوگوں کا استاد مقرر کردیتے تھے۔ یہ پریشان حال اور پراگندہ ذہن لوگ اپنے ہی مسائل میں اتنے الجھے رہتے تھے کہ ہم لوگوں کی تعلیم و تربیت پر بہت کم توجہ دے پاتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تقریباً بے استاد رہنا پڑا۔ ہاں کچھ دنوں اپنے ایک نانا سے جنہیں آخری دور میں ڈپٹی نذیر احمد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا موقع ملا تھا، کچھ دنوں اردو فارسی پڑھی۔ کاش اور پڑھ سکتا۔

مونگیر سے علی گڑھ تک کے تعلیمی دور پر نظر ڈالتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ فطری ذہانت کے باوجود ایک اوسط طالب علم رہا جس نے برائے نام کنسیشن اور رعایت کے لئے طلباء کی تحریک میں حصہ لیا اور نہ بہت پڑھاکو رہا۔ بلکہ ساحل پر کھڑا رہنے والا ایک حساس آدمی جو معاملات کو سمجھتا تھا پر بھیڑ کا جزو نہیں بننا چاہتا تھا۔

عام طور پر ایسے طالب علم کتابی کیڑے بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ کالج تک کوئی استاد ملا جو پڑھنے کا ذوق پیدا کرتا اور نہ اپنے گھر یا پڑوسی کے گھر داستانوں اور ناولوں کا ذخیرہ تھا کہ انہی سے اپنا دل بہلاتا۔ ایک بات ضرور ہوئی۔ ایک مہاشئے جو گھوم گھوم کر روسی کتابیں بیچا کرتے تھے ان کی دستگیری کی خاطر والد کمیونسٹ لٹریچر خرید کر لایا کرتے تھے۔ وہ صاحب تو اب اچھی بری کتابوں کے باضابطہ دوکاندار بن گئے اور کمیونزم سے تائب ہوگئے، مگر ابتدائی عمر میں میں نے روسی اور مارکسی لٹریچر کا جو ٹوٹا پھوٹا مطالعہ کیا وہ زندگی کے ہر موڑ پر مدد پہنچاتا رہا ہے اور ساتھ ہی آزردہ خاطر بھی کرتا ہے۔

ان کتابوں کے طفیل بہت ساری زبانوں کے ادب اور ملکوں کی تاریخ کا جی بھر کے مطالعہ اور ڈگریوں سے لیس ہو کر جب طالب علمی کا دور گزار چکا تو پھر روزگار کا مسئلہ آیا۔

والد چاہتے تھے کہ ان کے قانون کے پیشے میں آجاؤں۔۔۔۔

ان کے گرد لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ وہ فیس لے کر کام کرتے تھے اور بہت سوں کو اپنی جیب سے آنے جانے کا خرچ دیا کرتے تھے۔ ایسے لوگ اپنی جھونپڑیوں

میں ان کی تصویر لگا کر آج تک ان کی پوجا کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اس پیشہ میں بھی ایمانداری اور انسانیت پرستی کی گنجائش ہے۔

مگر مجھے تو فوج کی ملازمت پسند تھی۔ نہ رشوت نہ ظلم بلکہ نیک اور اعلیٰ مقصد کے لئے اپنا خون بہانے کو بھی تیار۔ میں فوج میں نہیں جا سکا۔ اس وقت کے مسلمان نوجوان "غدار" اور "پاکستانی" کہلانے کے بجائے پاکستان سدھار جاتے تھے۔ لیکن میں اتنا بھی بزدل یا کیریرسٹ نہیں تھا۔

اسکول میں گیا۔۔۔ ٹیوشن اور درسی کتابیں لکھنے کا شوق۔۔۔ پڑھانے سے کوئی مطلب نہیں۔ جس کی وجہ سے معمولی اور ادنیٰ قسم کے سیٹھوں کا جو مجلس انتظامیہ میں رہتے رعب۔ یہ رنگ ڈھنگ بالکل پسند نہیں، نتیجہ میں لڑائی جھگڑا۔

کالج میں گیا۔۔۔ سیاست، توڑ جوڑ، خوشامد۔۔۔ توبہ بھلی!

لڑکیوں کے کالج میں گیا۔۔۔ چھوٹے شہروں کی بیاہی مہیلا لکچررز یا اُٹھتی جوانی والی طالبات۔۔۔ معمولی سے کچھ بہتر شکل اور جرأت والے مردوں پر مرمٹنے کو تیار۔۔۔ بھاگو بھائی بھاگو!

اس بھاگم بھاگ کی وجہ ڈر بھی تھا۔ کیسا؟ آگے بتاتا ہوں۔۔۔

دوسری بات تو وہ تھی جو سجاد انصاری بتا گئے تھے کہ حضرت یوسف کوئی غیر معمولی شکل و صورت کے آدمی نہیں تھے بلکہ صرف مردانہ انانیت کے مالک تھے۔ عورتوں کے پیچھے بھاگنا تو دور رہا، نظر اٹھا کر بھی دیکھنا گوارہ نہیں کرتے تھے۔ جب ہی زنانِ مصر تململا اُٹھی تھیں اور انہیں مصری قید و بند کی صعوبت جھیلنی پڑی تھی۔۔۔ اور یہاں تو اسیر زلف گرہ گیر ہونا بھی پسند نہیں تھا جبکہ راہ میں زلفوں کے بے شمار دام بچھائے گئے۔

سچ پوچھا جائے تو محبت تو مجھے صرف ایک ہی لڑکی سے ہوئی۔۔۔ فوزیہ یعنی اپنی لڑکی سے۔ اور عشق بھی جس میں جنس کا زبردست دخل ہوتا ہے ایک ہی ہستی سے ہوا۔۔۔ عرشیہ سے جو ہماری جیون ساتھی اور بہترین رفیق ہے۔

اور وہ ڈر جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ۔۔ فسادات کا تھا۔ معمولی معمولی بات پر ہندوستان میں فسادات ہوتے رہے ہیں اور خاص کر لڑکیوں کے لئے۔ ان فرقہ وارانہ فسادات نے ہماری نسل کے لوگوں کے قلب و ذہن پر بہت خراب اثر ڈالا ہے۔ لوگ وطن سے بے وطن ہوتے رہے یا پھر تارک الدنیا۔۔ حکومتِ وقت بھی مذہبی غلو کی تائید کرتی ہے۔

لیکن ہم لوگوں نے جو اس تعصب، تنگ نظری اور بے انصافی کو مٹانے کا عزم رکھتے تھے کسی اور راستے کو چنا۔۔۔ مزدوروں کا محاذ، کڑی سے کڑی محنت کرنے والے لوگوں کی خدمت کا ڈھونگ بھرنے والوں، چکنی چپڑی باتیں کر کے محنت کشوں کا دل خوش اور ہر خدمت کا صلہ ان کے خون پسینہ کی کمائی سے لینے والوں کی صف میں آ گئے۔ یہ بھی خدا کے کیسے نیک بندے ہوتے کہ اچھی باتیں سن کر خوش ہوتے اور خراب باتوں سے بھی مایوس اور بددل نہیں ہوتے۔۔۔ ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے چندہ دے کر لیڈروں کا ناشتہ منگواتے ۔۔۔ برسوں پہلے کیا ہوا وہ ناشتہ آج تک ہضم نہیں ہوا ہے۔

بہتر یہ سمجھا کہ قلم کو ہتھیار بنالوں۔ تخلیقی اور تنقیدی مضامین تو انے گنے لوگوں کے لئے ہوتے ہیں۔ صحافت کے ذریعہ وسیع تر آبادی کے عقل وشعور کو بیدار کرنے چلے تو پتہ چلا کہ اردو صحافت میں آکر ''بول'' میں اٹکے ہیں اور اب تو طوطے کی طرح رٹنے کا سلسلہ ہے، زبان سے نہیں قلم سے... لکھنے والا طوطا بن کر رہ گیا۔

۵۰ سال پہلے ۱۴ اور ۱۵ اگست کی آدھی اور درمیانی رات کو جہاز، کل کارخانے اور ریلوں کی ایک ساتھ بجتی سیٹیوں اور سائرنوں کو بھی سنا تھا اور ۱۹۵۰ء کی ۲۶ جنوری کو مٹھائیاں بھی کھائی تھیں اور آتش بازیوں سے بھی لطف اندوز ہوا مگر آزادی کا سچا احساس اور خوشی ۱۹۶۷ء میں ہوئی جب کئی ریاستوں میں ''باپو اور چاچا'' کے نام لیواؤں کا راج سنگھاسن ڈانواڈول ہوا۔ تو مغربی بنگال میں بھی یہ خوشگوار تبدیلی آئی۔ ایسا لگتا تھا کہ ایک سال پہلے تک ظلم وجور کا جو سلسلہ تھا اور ہم درمیانہ طبقہ والے بونس اور بھتہ کے لئے ''جدوجہد'' کر رہے تھے اور راج بھون کے سامنے خود کو گرفتار کرنے کے لئے پیش کیا تھا وہ رنگ لایا... حالانکہ یہ کارنامہ دبے کچلے عوام کا تھا۔

۴۷ء میں ملنے والی آزادی کی خوشی تو خوف میں ڈوب گئی تھی۔ ۶۷ء میں سرخ پرچم لہرایا۔ سارے لوگوں کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا اور چھاتیاں پھول گئیں۔ پر یہ بھی سراب نکلا۔ عوامی جوش کے سہارے اوپر آنے والے چند لوگوں کی خوشنودی کے لئے اپنی ہی حکومت کو وحشی کہنے اور عوام کا مقدر بدلنے والے جن ساتھیوں سے ہاتھ ملایا تھا ان ہی کے ''رجعت پسندانہ'' رویہ کی شکایت کرنے لگے۔

علاج غم ہجراں اور بھی ہیں.... اور بھی ہیں

عوام کا مقدر بدلنے والے شاہین بچے کفن بردوش آ گئے۔ مایوسی کے اندھیرے کو دور کرنے کے لئے اپنے خون کا چراغ جلانے... سرکار کی تیوریاں چڑھ گئیں.. سپاہی، فوج، سنگین، رائفل اپنے ہی جگر گوشوں کا سینہ چھلنی کرنے لگی... بنگلہ دیش کا مسئلہ ایک عذر بنا۔

یار دوست کہتے اپنا لہجہ مدھم کرو ... اخبار بند

چوری چھپے میٹنگیں ہوتیں ... محاصرہ اور تعاقب

روٹی کا سہارا تو چاہیے ... گڈس ٹرانسپورٹ کمپنی میں خود کو چھپا لیا۔ لو یہاں تو پولیس کے چھوٹے بڑے اہلکاروں کا زیادہ دخل ہے اور ان کی چھید کرنے والی نظریں تعاقب کر رہی ہیں.. دور افتادہ علاقے کے ایک کیمکل کمپنی میں ملازمت۔ سدھار تھ شنکر کا زمانہ جب کانگریسی رنگروٹوں کی بن آئی تھی اور قانون ان کے گھر کی لونڈی تھا۔ کارخانہ کی یونین پر ان کا قبضہ۔ کارخانہ کا مالک جو بڑا طرم خاں بنتا تھا۔ یونین لیڈر کے سامنے بھیگی بلی بنا ان کے ہر جائز و ناجائز مطالبات کو پورا کرنے کو تیار۔ سارے مزدور مجھ سے خوش.. مالک مجھ سے بیزار.. یوں کہ میں صحیح اور صاف باتوں کا عادی۔

لہٰذا اس رزق سے موت اچھی جس سے پرواز میں آتی ہو کوتاہی۔

بمبئی آکر ایک ساتھ تین اخباروں میں خون جلانے کے بعد ریڈیو، ٹی وی اور اشتہاری ایجنسیوں کا چکر۔ ضرورتیں تگنی کا ناچ نچا رہی تھیں، صبح سے شام تک مشقت اور رات کہیں گزار لیتا... فٹ پاتھ پر بھی اور بھٹیار خانہ کا کھانا۔ ڈی کلاس ہو کر آنے پر یہ باتیں بالکل نہیں کھلیں۔۔۔ مگر.... باپ مر گئے... جا نہیں سکا۔

ٹی بی نے آدبوچا۔ ڈاکٹر نے کہا کیس بگاڑ کر آئے ہو اسپتال جاؤ۔ اسپتال میں گھڑکیوں اور جھڑکیوں کے درمیان کہا گیا، پھیپھڑے کاٹے جائیں گے۔ دن جس تس طرح گزر جاتا۔ کمزوری کے باعث بس کے انتظار میں تیورا تیورا کر گر پڑتا۔ رات کو کسی کی تلاش ہوتی کہ کسی دم بھی موت کے فرشتے کے آجانے کا کھٹکا رہتا تھا۔ بیوی بچے تیرہ سو کیلو میٹر دور۔۔۔ باپ ماں اور بھائی بہن اور بھی فاصلے پر۔ کروٹ بدلنے میں زحمت ہوتی۔

ایسے میں ایک انجان آدمی کھڑکی کے راستے آتا... پتہ نہیں کوئی آدمی تھا یا آدمی کی تمنا یا ایک "ہلوسی نیشن" اس کے آنے پر بڑی ڈھارس بندھتی۔ ایک دن بریف کیس میں سو سو روپے کی ان گنت گڈیاں لے کر آیا۔ روپے کے بدلے میری جان کا سودا کرنے۔ میں نے منہ پھیر لیا۔ کہ کنکریٹ کے اس جنگل بمبئی میں بچپن کا گوتم مال و منال یا گلیمر کی تلاش میں نہیں آیا ہے۔ اس کے بعد وہ آیا اور نہ اس کا خیال۔

آخری بار چرنی روڈ پر بس کے انتظار میں جب غشی طاری ہونے لگی تو خود کو سنبھالا اور ایسا سنبھالا کہ بیماری بھی دور ہو گئی۔ شاید قوتِ ارادی کا کرشمہ تھا۔

ایسا لگتا ہے کہ ساری عمر رائیگاں گئی اور رہ بھی کم گئی ہے اس لئے اپنی جائے پیدائش جہاں کا ماحول اتنا پر سکون اور پر فضا ہے کہ چڑیوں کی چہکار، ہوا کی سرسراہٹ اور پتوں کے ٹوٹ کر گرنے کی آواز بھی صاف سنائی دیتی ہے، دامن دل کھینچتی ہے۔ وہ لوگ بھی بہت یاد آتے ہیں جو اپنے ہیں مگر بیچ میں وقت اور جگہ کی دوری حائل ہو جانے پر غیروں جیسے ہو گئے ہیں۔

جانے وہاں کیا کچھ بدلا؟ ملک میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اگلی نسل کا کیا ہوگا... اس نسل کا جس سے ہماری لڑکی اور لڑکے (جواب خود اپنے گھربار والے ہو چکے ہیں) کا بھی تعلق ہے۔ انہیں تو اور بھی برے دن دیکھنے ہوں گے شاید...

سال چھ مہینے پر بیوی بچوں سے کلکتہ میں جب ملاقات ہوتی تھی تو سب اپنا اپنا حال سناتے تھے۔

ایک دن بیوی کہنے لگی۔۔۔

"ناصر کی بدمعاشیاں بڑھتی جارہی ہیں۔ اب یہ ہمارے قابو میں نہیں رہتا۔ لے جاؤ اپنے ساتھ.... یہاں پھیری والوں اور خوانچہ والوں کے ساتھ مل کر ان کا مال بیچنے لگا ہے..."

یہ سن کر ہمیں یک گونہ اطمینان ہوا... بیوی سے کہا۔

"روکو مت اسے.... خرید و فروخت کی عادت پڑنے دو۔ سفید پوش بابو بن کر ضمیر کا سودا تو نہیں کرے گا۔"

اپنے اس ذہنی و فکری رجحان کے ساتھ ہمیں بھی اسی سیاسی اور معاشی حالات میں جینا پڑا ہے جس کے گھیرے یا شکنجہ میں اس ملک کے بے شمار لوگوں کو زندگی بسر کرنی پڑ رہی ہے۔ اسی زندگی کی چند قاشیں اس کتاب میں پیش کی جارہی ہیں۔ کیونکہ تحریروں میں ہم خود ہی سیاسی اور سماجی حقیقت کا احاطہ پیش کرنے کے حق میں ہیں۔ زندگی کی اگر یہ سچی اور سنگین کہانیوں کو لوگوں نے پسند کیا تو اور بھی ہیں ۔

ہم پہ جو گذری ہے بس اس کو رقم کرتے ہیں
آپ بیتی کہو یا مرثیہ خوانی کہہ لو

محمود ایوبی

C-3، پراپتی ہاؤسنگ سوسائٹی، چکو واڑی (شمپولی)
بوریولی (ویسٹ) ممبئی 400092،

جنازہ

فضلو نے پہلا ہی گھونٹ مارا تھا کہ دروازے کو کسی نے ٹھونکا ۔ ۔ ۔ ۔

چار دن تک کڑاکے کی دھوپ میں اس نے جوان بھائی کی میت کو ملک لے جاکر دفنانے کے جھمیلے اور اس سے بھی بڑھ کر سب جمع جتھا بلکہ اوپر سے ادھار لے کر مٹھی بھر روپیہ پھونک کر لوٹتے لوٹتے جیسے وہ ٹوٹ کر رہ گیا تھا. شام کو گھر آتے ہوئے جان کے اڈے سے وہ آدھا سیر جامن کی دارو لیتا آیا تھا کہ کچھ غم غلط کرے گا. غم تو خیر کیا غلط ہوتا، ہاں نس نس میں سمائی ہوئی تھکن کو مٹانا چاہتا تھا. چائے والے گلاس میں پانی ملی دارو کا اس نے پہلا ہی گھونٹ لیا تھا کہ کسی نے دروازہ ٹھونکا۔

پہلے تو اس کا کلیجہ دھڑک کر رہ گیا۔ مگر پھر بے وقت کسی کے دستک دینے پر اسے غصہ آیا۔ جملو کے مرنے کی خبر آئی تھی تو جان پہچان کا ایک آدمی بھی نہیں دکھا تھا۔

دروازہ پھر ٹھونکا گیا اور اس بار زیادہ زور سے ٹھونکا گیا. اس کے ساتھ ہی کسی نے یہ بھی پوچھا کہ فضلو کی کھولی یہی ہے۔ تب اس نے گلاس مٹی کے کالے مٹکے کی اوٹ میں رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ یہ کون ہو سکتا ہے باپ۔۔۔۔۔ آواز تو پہچانی ہوئی نہیں لگتی۔

فضلو نے گردن باہر نکالی تو سامنے ایک حوالدار کھڑا تھا۔ ایک دو گھونٹ مارنے پر رگ پٹھے میں جو بھی سنسناہٹ دوڑی تھی وہ حولدار کو دیکھتے ہی ہرن ہو گئی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سالا پولس کا آدمی اس وقت یہاں کیا لینے کو آیا ہے اور ہمارا نام کیوں لے رہا ہے۔۔۔ لگتا ہے کوئی نیا لفڑا ہو گیا ہے مفت میں۔ ہمت کر کے اس نے پوچھا۔۔

" کیا ہے حولدار صاحب۔۔۔ فضلو کو کس واسطے پوچھتے ؟ میں ہی فضلو ہوں۔۔۔ بولو کیا بات ہے؟ "

حولدار کو اس نے غور سے دیکھا تو اس کے چہرے سے لگتا ہی نہیں تھا کہ پولس کا کوئی آدمی ہو۔۔۔ بلکہ اس کا چہرہ عام آدمی کی طرح لگا۔۔۔۔ دکھ بھرا۔ اس نے بڑی ملائمت سے کہا۔

"دیکھو فضلو بھائی۔۔۔ ذرا چوکی تک چلو۔ صاحب تم کو بلاتا ہے۔"

صاحب مجھ کو کاہے کو بلاتا ہے؟ میں تو کسی لفڑے وفڑے میں رہتا نہیں بھائی" فضلو نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں کوئی لفڑے کی بات نہیں ہے۔۔۔" حولدار سمجھانے لگا۔ اسپتال کا کوئی معاملہ ہے۔۔شاید تمہارے بھائی کا ڈیتھ ہو گیا ہے۔اس واسطے صاحب تم کو بلاتا ہے۔"

واکولہ جھونپڑپٹی میں فضلو کی ایک کھولی تھی جس میں وہ اپنی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ دن بھر وہ ٹیلر کی دکان میں کام کرتا اور بیوی گھر سنبھالتی۔ دو بچے میونسپلٹی کے اسکول میں پڑھتے تھے۔ ٹیلرنگ کے کام سے فضلو کو اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ اتنی کمر توڑ مہنگائی نہ ہوتی تو بڑے موج سے زندگی گذر سکتی تھی۔ پھر بھی سب خرچ پورا ہو جاتا تھا۔ مگر آمدنی اتنی نہ تھی کہ کچھ بچے اور نہ کھولی میں اتنی گنجائش تھی کہ ایک آدمی بھی زیادہ رہ سکے۔ چاہے اپنا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے جب اس کا چھوٹا بھائی جملو ملک سے آیا تو اپنے ایک گاہک سے جو کسی مل میں آفیسر تھا کہہ سن کر فضلو نے اسے ورکر لگا دیا اور اس سے کہا کہ ادھر ہی مل کے آس پاس اپنے رہنے سہنے کا انتظام کر لو۔

جملو بھی سمجھ دار لڑکا تھا اس لئے اس نے میسی میں کھانا شروع کیا اور چالیس روپیہ مہینہ پر ایک کھولی میں جہاں اور بہت سارے لوگ رہتے تھے، اپنے رہنے سہنے کا انتظام کر لیا۔ چھٹی کے دن بھائی سے ملنے آتا تھا تو بچوں کے لئے کچھ نہ کچھ لے کر آتا تھا۔

اور سب بات تو ٹھیک تھی مگر ایک غلط کام اس نے یہ شروع کر دیا تھا کہ یونین کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ فضلو نے سمجھایا بھی کہ بھائی ابھی تم ٹمپریری ملازم ہو کسی بھی سے ہٹا دئے جاؤ گے اس لئے ان جھمیلوں میں نہ پڑو۔ اس کے علاوہ تم کو معلوم نہیں کہ یونین لیڈر صرف اپنا الو سیدھا کرنا جانتے ہیں۔ مالکوں سے ان کی سانٹھ گانٹھ ہوتی ہے۔ کوئی بپتا پڑے گی تو یہ نظریں پھیر لیں گے جیسے کبھی کی جان پہچان ہی نہ ہو۔ یوں جھوٹے دلاسے دلا دلا کر تمہیں بوڑھا کر دیں گے۔

مگر جملو جوانی کے نشے میں کچھ سمجھتا ہی نہیں تھا۔ بھائی جو کہتا اسے سر جھکا کر سنتا اور جواب کچھ نہیں دیتا تھا۔ مگر بیچ بیچ میں غائب ہو جاتا تھا تو فضلو کو بڑی چنتا ہو جاتی تھی۔ اس کے اتوار کا سارا مزہ کرکرا ہو جاتا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں بڑبڑاتا تھا۔ "بڑا لیڈر بنا ہے۔ اس کو تو پکڑ کر اتنا مارے کہ سب یونین پھونین بھول جائے۔ کچھ خیال ہی نہیں سور کو۔"

اس کی بیوی سمجھاتی۔۔۔"ارے گھر چلا گیا ہوگا۔۔۔ نئی بیوی ہے۔ چھوٹا بچہ ہے اس کو دیکھنے۔ تم تو بے فضول میں کڑھنے لگتے ہو۔۔۔"

تو وہ کہتا۔۔۔''ارے جائے نا گھر۔ روکتا کون ہے۔ مگر بتا کر جانے میں کیا ہوتا ہے۔ تو نیں جانتی کمرن کہ بمبئی سالا بڑا مادر چود شہر ہے۔ جب تک آدمی گھر نہیں آجائے سمجھو خیریت نہیں ہے۔۔۔ اور یہ یوت کو لیڈری کا جو روگ لگا ہے سو الگ ہے۔ جب نہ تب ایک یونین والا دوسرے یونین والے کا گلا کاٹنے کو تیار رہتا ہے۔''

''تم تو ایسی ہی منحوس بات نکالتے ہو۔'' اس کی بیوی جھڑکتی۔

- - - - - -

کون تھا وہ۔۔۔ شاید اس کی کھولی کا کوئی ساتھی تھا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹا کر فضلو کو جو خبر دی اسے سن کر فضلو کو ایسا لگا کہ ایک تیر سینے کے پار ہو گیا اس کا سر چکرا اٹھا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اگر چوکھٹ نہیں پکڑ تا تو دھڑام سے نیچے گر جاتا۔

فضلو نے خود کو گرنے سے تو بچا لیا مگر رونا جو آیا تو اسے نہیں روک سکا۔ بلکہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ بچے تو اسکول جا چکے تھے۔ قمرن نے جو یہ نقشہ دیکھا تو وہ بھی گھبرا اٹھی اور پوچھنے لگی۔

''ارے کیا ہوا؟ کچھ بولو تو سہی کہ کیا بات ہے؟''

''کیا بولوں کمرن۔۔۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔۔۔ یہ بولنے آیا ہے کہ جملو اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ اس کی لاش اسپتال میں پڑی ہے۔''

قمرن کو بھی رونا آ گیا۔۔۔ جملو اس کا دیور ہی نہیں چچیرا بھائی بھی تھا۔

لیکن رونے سے کیا ہونے والا تھا۔ اب تو بھائی کی تجہیز و تکفین کا انتظام کرنا تھا۔ فضلو نے نڈھال سی آواز میں بیوی سے پوچھا۔ ''کچھ پیسے ویسے ہیں گھر میں؟''

گھر کے خرچ سے قمرن نے کاٹ کاٹ کر جو رقم بچائی تھی وہ سب شوہر کے سامنے رکھ دی۔ فضلو نے اسے جیب میں رکھا اور بچوں کو اسکول سے لے آنے کی ہدایت دے کر اس آدمی کے ساتھ، جو یہ خبر دینے آیا تھا، چل پڑا۔

سب سے پہلے تو وہ اس دکان پر گیا جہاں وہ کام کرتا تھا۔ دو چار ساتھی آ چکے تھے۔ اس کی پتا سن کر لوگوں نے مل جل کر تین چار سو روپے اکٹھا کئے اور فضلو کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ سیٹھ آیا تو اس سے بھی فضلو نے پانچ چھ سو اڈوانس مانگے سیٹھ سے بھی ایسے موقع پر انکار نہیں کیا گیا بلکہ اس نے یہ بھی پوچھا کہ دفن یہیں کرو گے یا لاش گاؤں لے جاؤ گے؟

سیٹھ کے پوچھنے سے پہلے فضلو کو یہ بات نہیں سوجھی تھی۔ اب اس نے بھی سوچا کہ جس طرح بھی ہو جملو کا آخری دیدار اس کی بیوی، ننھے بچے اور بوڑھی ماں کو تو کرا ہی دے۔ اس نے کہا۔

"سیٹھ جی اگر گاؤں لے جانے کا کوئی بندوبست ہو جائے تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

سیٹھ نے کہا "سوسائٹی کی ایمبولینس گاڑی تھوڑے خرچ پر مل جائے گی۔ جب تک تم اسپتال کے جھمیلے سے نپٹو۔"

سیٹھ اور فضلو کے ساتھیوں نے ہمدردی تو خوب دکھائی مگر اسپتال تک جانے کی پیش کش کسی نے نہیں کی۔ تب وہ چلنے کو ہوا اور سہارے کے لئے اس نے جملو کے ساتھی سے اسپتال تک چلنے کو کہا تو وہ بولا۔

بھیا! ہمارا ہرجا ہوگا۔۔۔ ہمیں کام پر جانے دو۔"

یہ سن کر فضلو کچھ دیر تک سُن رہ گیا۔ پھر اس نے کسی گہرائی سے نکلتے ہوئے کہا۔۔۔

ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔۔۔ ناغہ کرنے کا کیا فائدہ۔۔۔ تم جاؤ اپنے کام پر۔۔۔ میں نپٹ لوں گا خود ہی۔"

وہ چلا گیا تو فضلو بڑبڑایا۔۔۔

"حد ہو گئی سالی۔۔۔ اس جگہ تو مُردہ بھی سب کا اپنا اپنا ہوتا ہے"

- - - - - -

سفید رنگ کی ایمبولینس کار گاؤں میں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ جب یہ کار فضلو جملو کے گھر کے سامنے رُکی تو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ بات کیا ہے۔

فضلو کی ماں، گاؤں کی عورتیں اور بچے وہاں آ گئے۔ جملو کی بیوی بھی بچے کو گود میں لئے دروازے تک آئی۔

موٹر سے فضلو نکلا، اس کی بیوی نکلی اور تینوں بچے نکلے۔ اس کو دیکھ کر اس کی ماں کھل اٹھی۔۔۔ مگر فضلو ٹوٹا پھوٹا ماں کی طرف بڑھا۔ اسے پکڑ کر رونے لگا۔ ماں نے کچھ سمجھا نہیں۔۔۔ مگر جب اسے دل دہلانے والی خبر سنائی گئی تو وہ پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔ جملو کی بیوی بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی ۔۔۔ پورے گاؤں میں ایک کہرام مچ گیا۔ عورتیں اندر جمع ہونے لگیں اور مرد باہر۔ اس کڑیل جوان کی موت کا سبھی کو غم تھا۔ آج وہ گھر کے سامنے پیڑ کے سائے میں ایک کھاٹ پر سفید

چادر سے منہ ڈھانکے سو رہا تھا۔ ہمیشہ کی نیند۔ اور اس کے عزیز رشتہ دار اور گاؤں کے لوگ جملو کا ماتم کر رہے تھے۔ مگر یہ حادثہ ہوا کیسے ؟ یہ کسی کو معلوم تھا اور نہ کوئی اس کے بھائی سے پوچھنے کی ہمت کر رہا تھا۔ بڑی دیر کے بعد ایک بزرگ نے کہا۔۔۔

"بھائی! یہی اللہ کی مرضی تھی۔ اب تو اس غریب کو آخری منزل تک پہنچایا جائے۔"

فضلو بولا "ہاں جلدی کیا جائے۔ ایسا لگتا ہے لہاس بگڑ چلی ہے۔ چیر پھاڑ الگ کر دی ہے سالوں نے۔"

لاش تو اسپتال ہی میں بگڑ چکی تھی۔ ایسی بگڑی تھی کہ نظر بھر کر فضلو کو دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ اسپتال اور پولس والوں نے جو کہا وہ کر کے بھائی کی لاش لے کر وہ گاؤں چلا آیا تھا۔

اس بزرگ نے جب پھر یہ پوچھا "مگر یہ ہوا کیسے فضلو۔"

تو اس کا جواب فضلو کے پاس بھی نہیں تھا۔ پولس والوں نے اسے بتایا کہ جملو کی لاش ریلوے لائن پر کٹی ہوئی ملی تھی۔ کیا پتہ وہ ٹرین سے گر کر کٹا یا کسی نے مار کر لاش پٹری پر ڈال دی تا کہ جرم کا سراغ نہ لگے۔ یا پھر بے ایمان پولس والوں ہی نے کھاپی کر پٹری کے پاس لاش ملنے کا قصہ گڑھ لیا۔۔۔

فضلو اس سوال کا کیا جواب دیتا۔ اسے خود کچھ نہیں معلوم تھا کہ اس کے بھائی کی موت کس طرح ہوئی۔ اسے بس اتنا معلوم تھا کہ اس کا جان سے پیارا بھائی اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ مر گیا اور اب پیڑ کے نیچے منہ ڈھانپے پڑا ہوا ہے۔ اس کی لاش بگڑ چلی ہے۔ پیڑ کے سائے سے پرے دھوپ ہے۔ جھلسا دینے والی دھوپ۔ ادھر دیکھتے دیکھتے فضلو کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ اندھیرا چھا گیا۔ ایسا اندھیرا کہ آس پاس بیٹھے لوگوں کی شکلیں بھی نہیں دکھنے لگیں۔ اندھیرا ہی اندھیرا۔

آس پاس کے لوگوں کو بھی اس کے دکھ کا اندازہ تھا۔ اس لئے کسی نے اس کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ گاؤں کے یہ ہمدرد لوگ جملو کے کفن دفن کے انتظام میں لگ گئے۔ گرمی اور دھوپ کی پرواہ کئے بغیر۔ کوئی کفن لانے چلا گیا اور کوئی قبر کھودنے۔ ہر آدمی اسے اپنا کام سمجھ کر لگ گیا۔

- - - - - -

جملو کو مٹی کے سپرد کر کے اور چہارم فاتحہ وغیرہ سے نپٹنے اور ماں اور جملو کی بیوی کو دم دلاسا دینے کے بعد فضلو اپنی بیوی بچوں کو ملک ہی میں چھوڑ کر بمبئی لوٹا بالکل ٹوٹا پھوٹا اور دنیا سے بے زار سا۔ آنے کے بعد اس کا کسی کام میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ بلکہ دل اچاٹ تھا۔ اس کا جی چاہا کہ

خوب لنڈھا کر شراب پئے۔ اتنی شراب کہ ہوش باقی نہ رہے۔ شام ہو چلی تھی۔ اس لئے جان کے اڈے پر جاکر آدھا سیر جامن کی شراب لے کر وہ کھولی پر آیا اور ابھی اس نے پہلا ہی گھونٹ مارا تھا کہ حولدار نیا جھمیلا لے کر آن پہنچا۔

پہلے تو اس نے حولداد کو ٹالنا چاہا۔ مگر جب اس نے یہ سمجھا یا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں تب بولا۔ ''اچھا حولدار تم چلو، میں پیچھے سے آتا ہوں۔ ذرا ہاتھ کا ایک کام نپٹا لوں۔''

اس نے سوچا اب چاہے جو بھی ہو، دارو ختم کئے بنا تو جائے گا نہیں۔ اس لئے حولدار کے جاتے ہی اس نے پھر دروازہ بند کر لیا اور دارو کے گھونٹ لگانے لگا۔ تیز تیز۔ شراب بھی اپنا اثر دکھانے لگی۔ مگر اس کا غم دور ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ کیونکہ یہاں پھر پولس کا جھمیلا کھڑا ہو گیا تھا۔ اسے لگا کہ پولس نے اب کوئی کیس کھڑا کیا ہے اور اسے گواہی میں گھسیٹنا چاہتی ہے۔ چاہے جو بھی ہو جائے وہ اس چکر میں نہیں پڑے گا۔ اس کا بھائی تو مر ہی گیا۔ اب یہ سالے کیس بھی کریں گے تو کیا ہاتھ آئے گا؟ الٹا تھانے کچہری کا چکر اور کام کا ہرجا۔ اب وہ ایک دن بھی کام کا ناغہ نہیں کر سکتا۔ پہلے تو صرف اپنی فیملی دیکھنی پڑتی تھی۔ مگر اب تو سارا بوجھ اسے ہی اٹھانا تھا۔ بوجھ سمجھ کر نہیں بلکہ ہنسی خوشی۔

لیکن دوسرے ہی لمحے اسے پھر یہ خیال آیا کہ چلے چلو باپ۔ یہ سالے پولس والوں کا کچھ ٹھیک نہیں۔ ابھی تو حولدار بڑا انسان بنا ہوا تھا۔ دیر ہو جانے پر یہی شیطان بن سکتا ہے۔ یہ لوگ نہ یہ سوچیں گے کہ فضلو نوجوان بھائی کی موت کے غم میں نڈھال ہے اور نہ کچھ اور۔ بس پیٹنا شروع کر دیں گے۔

یہ سوچتے ہی اس کی ساری کیفیت غائب ہو گئی۔ اس لئے اس نے لمبے لمبے گھونٹ بھرے اور تھوڑی سی دارو ایک چھوٹی سی بوتل میں ڈال کر جیب میں رکھ لی اور چوکی کی طرف چل پڑا۔

پولس چوکی پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ انسپکٹر پوری وردی پہنے ہاتھ کے بیت کو لپلپا لپلپا کر ٹہل رہا تھا۔ فضلو کو ڈر لگا۔ اس نے سوچا کہ پچھلے پاؤں بھاگ جائے مگر بچ کر جاتا کہاں؟ پکڑوا کر منگوانے پر سالا کچھ زیادہ ہی پیٹتا۔ اس لئے اللہ کا نام لے کر اندر چلا گیا۔ وہاں وہ حولدار بھی تھا جو اس کو بلانے گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر کہا۔

صاحب! جی فضلو آگیا۔

انسپکٹر نے بڑے رسان سے کہا۔ ''اچھا یہی فضلو ہے۔ اِتا دیر کہاں لگا دیا بھائی۔ چلو آؤ۔

فضلو کو انسپکٹر کے نرم لہجے سے کچھ ڈھارس بندھی۔ مگر یہ پہیلی سمجھ میں نہیں آئی کہ اب اسے لے کہاں جایا جارہا ہے۔ حولدار اس کو لے کر پچھلے حصے میں بیٹھا اور انسپکٹر آگے۔ اور جیپ چل پڑی۔ جیپ چلتی رہی اور اس کے ساتھ اس کا دماغ بھی چکراتا رہا۔ ''یہ سالا کہاں لے جارہا ہے۔ ؟ کس لفڑے میں ڈالنا مانگتا۔ اس سے زیادہ وہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ دماغ اس کا سُن ہو رہا تھا۔

جیپ اسپتال میں داخل ہوئی۔ اس اسپتال میں جہاں سے چند دن پہلے وہ اپنے بھائی کی لاش لے گیا تھا۔ جیپ کارونر کے آفس ہی کے پاس رکی۔ وہاں کوئی ٹکلا آفیسر بیٹھا تھا جو پہلے دن نہیں تھا۔ انسپکٹر نے اسے سلام کر کے کہا۔

''یہ آگیا اسامی کا بھائی''

''اچھا۔ اچھا۔'' پھر اس نے رجسٹر کھولتے ہوئے پوچھا''کیا نام ہے تمہارا؟''

''فضلو۔ فضل حسین۔''

'' پورا نام بولو بھائی ۔ باپ کے نام کے ساتھ''

''فضل حسین، دلدار حسین۔''

''ٹھیک ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ۔۔۔۔''

''ہاں صاحب۔ اس کا ڈیتھ ہو گیا۔ بالکل جوان تھا۔''

فضلو کی بات پر زیادہ دھیان دئے بغیر ٹکلو افیسر نے لال آنکھوں والے بھنگی کو جس کا چہرہ بھیانک ہو رہا تھا، بلا کر کہا''اسے مورگ (Morgue) میں لے جاؤ۔''

وہ بھنگی اسے مردہ خانے میں لے چلا۔ برآمدے میں پہنچتے ہی فضلو کو بھبکا سا لگا۔ ایسے ہی اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ اوپر سے مردہ خانے کی بدبو سے وہ اور بھی چکرا کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اندر اور بھی بدبو ہو گی۔ بالکل ناقابل برداشت بدبو۔ اس لئے جیب سے باٹلی نکال کر بچی ہوئی شراب وہ ایک ہی گھونٹ میں پی گیا۔ بھنگی مسکرایا تو اس نے باٹلی کو باہر لڑھکا دیا۔ یہ جتانے کو کہ مسکراتا کیا ہے۔ اس میں کچھ نہیں ہے۔ اب تو ٹھینگا چاٹ۔

مردہ خانے میں ایک قطار سے لاشیں پڑی تھیں۔ سفید چادر سے ڈھکی ہوئی۔ مگر سب کی ٹانگیں کھلی اور ٹانگوں میں نام اور پتے کی سلپ بندھی تھی۔

بھنگی نے ایک لاش کا چہرہ کھولا تو سامنے جملو پڑا ہوا تھا۔ یہ کیا قصہ ہے باپ۔ جملو کو تو وہ

ایمبولینس میں لاد کر گاؤں لے گیا تھا۔ وہاں گاؤں والوں نے اس کا کفن دفن کیا۔ اس کا چہارم اور نیاز تک ہوا۔ پھر یہ یہاں کیسے آ گیا۔ منوں مٹی کے نیچے سے نکل کر پھر اس جہنم میں کیسے آ گیا۔؟

فضلو کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ بھنگی بے شرمی سے مسکرا رہا تھا۔ اس نے اپنے حواس کو درست کرتے ہوئے سوچا کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی شکل کے دو آدمی ہوتے ہیں۔ یہاں بھی وہی معاملہ ہے کیا۔؟ مگر سامنے جملو کو پڑا دیکھ کر بھی اس کا دل نہیں مان رہا تھا۔ اس نے سانس روک اور ناک پر ہاتھ رکھ کر قریب سے جملو کو دیکھا۔ بائیں کنپٹی کے اوپر چھوٹا سا مستا بھی تھا۔ داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی ٹٹولی۔ اس انگلی میں بچپن میں کٹنے کا داغ بھی تھا۔ مگر پہلے اسے جو لاش دی گئی وہ کس کی تھی؟ وہ اگر دھوکا کھا گیا تو پورا گاؤں۔ گھر کے سارے لوگ، کیا سب دھوکا کھا گئے؟ یہ سالا کیا چکر ہے؟

وہ دیوانوں کی طرح بھاگتا ہوا باہر آیا اور چڑھی ہوئی سانس سے بولا۔

''یہ کیا کہتے ہے ساب؟ آپ لوگ یہ کیسا مذاخ کر رہے ہو؟''

ٹکلا افیسر بولا ''مذاق وزاق نہیں۔ تم اپنے بھائی کی ڈیڈ باڈی لے جاؤ۔''

''مگر ابھی پرسوں تو میں اپنے بھائی کا جنازہ لے گیا ساب۔ یہاں پنچنامہ بھی ہوا۔''

''ہاں ہاں۔۔۔ پنچ نامہ بھی ہوا تو کیا ہوا۔ آدمی کچھ مشین تو نہیں ہوتا۔ ہو جاتی ہے غلطی۔''

''گلتی، کیسی گلتی ساب؟''

''یہی کہ تم کو دوسرے کی ڈیڈ باڈی دے دی گئی۔ تمہارے بھائی کی یہیں پڑی ہے۔''

''لیکن میں تو اسے ملک لے گیا ساب۔ وہاں اس کا کفن دفن ہوا۔ چہارم فاتحہ ہوا۔ کرج ادھار کر کے ہم نے ہزار بارہ سو روپیہ کھرچ کیا۔''

''یہ سب حساب تو ہمیں سناؤ نہیں۔۔۔ لے جانا ہے ڈیڈ باڈی تو لے جاؤ، نہیں تو لاوارث ٹھہرادی جائے گی۔''

''لاوارث ٹھہرادی جائے گی۔۔۔ کیا انصاپھ ہے؟ دھیان سے کام نہیں کرتے اور سب آدمی کو پریشان کرتے ہو۔''

انسپکٹر ابھی تک چپ تھا مگر فضلو کو بڑھ چڑھ کر بولتا سن کر بیت لپلپاتا ہوا اٹھا اور گالی دے کر بولا ''ابے لے جانا ہے تو لے جا۔ نہیں تو نکل یہاں سے۔۔۔'' اور پھر کارونر سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''یہ سالا ذمہ داری سے بچنے کے لئے یہ ناٹک کر رہا ہے۔ حولدار نکالو اسے باہر۔''

”ٹھیک ہے نکال دو‘ نکالتے کیوں ہو، میں آپ چلا جاتا ہوں۔۔ مگر تم لوگوں نے لباس بدل کر ساب اچھا نہیں کیا۔۔۔ بالکل اچھا نہیں کیا۔ آپ اپھیسر لوگ مرنے کے بعد بھی غریب سے مذاخ کرتے ہو۔ چھی۔۔ کھیر۔۔۔ جملو تو لاوارث نہیں مرا ہے۔۔ میں تیرے جنازہ کو گاؤں لے گیا۔ تیرا چہارم فاتحہ کروایا ۔۔۔ اب یہ لوگ پھر کہتا ہے۔۔ تو بیٹا اب تیرے بھائی میں اور سکت نہیں ہے۔۔۔ تیرے حصے کا میں نے سب کیا۔۔۔ جو سالا تیرے کو لاوارث بتاتا ہے وہ سالا جھوٹا ہے ۔۔۔ پاجی ہے ۔

آتنک

یہ یقیناً ہمارے اور ہمارے دوستوں کے لئے خوشی کی بات تھی کہ ہمیں جو کمرہ ملا تھا وہ نہ صرف کشادہ اور سڑک کے کنارے بلکہ مسلم لوکیلٹی میں تھا۔ ورنہ ہم بڑے آزاد اور ترقی پسند کہلاتے ہیں۔ لیکن وقتاً فوقتاً اس کاسموپولیٹن شہر میں کبھی علاقہ، کبھی زبان اور کبھی مذہب کے نام پر جو دنگے ہوتے رہتے ہیں ان میں کسی نہ کسی لحاظ سے ہم بھی زد میں آتے رہے ہیں۔ ایسے ہنگامی حالات اور خطرے کی گھڑی میں خواہش کے باوجود ہمارا کوئی دوست یا آشنا ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اپنی جان خطرے میں ڈال کر کوئی کسی کی مدد کر بھی نہیں سکتا۔ خواہ مدد کا محتاج شخص کوئی دوست ہی کیوں نہ ہو۔

لہٰذا جب محفوظ علاقے میں ہماری معقول رہائش کا انتظام ہو گیا تو ہمیں جو سکون ملا وہ تو الگ رہا ہمارے دوستوں نے بھی اپنے اپنے اطمینان کا اظہار کیا اور پھر ہم لوگ مل جل کر خوشی منانے لگے۔

درمیانہ درجے کے لوگوں کو خوش ہونے کے لئے کچھ آسمان کے تارے تو چاہئیں نہیں۔ بس اتنا ہی ہو کہ کچھ دیر ایک ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کر سکیں یا کسی چالو موضوع پر ہلکی پھلکی باتیں کر لیں اور پھر اپنی اپنی راہ لیں۔

جو شخص خود ایک معمولی قسم کا ملازم ہو یعنی بمشکل تمام اپنی سفید پوشی نبھار ہا ہو ظاہر ہے اس کے یار دوست بھی کوئی بڑے تیس مار خاں نہیں ہوں گے۔ ایک آدھ کی حالت اگر قدرے بہتر ہو تو اسے نہیں گنا جاتا۔

تو ہم لوگ دن بھر کی چاکری اور محنت مشقت کے بعد جب اپنے اپنے گھر لوٹتے تھے۔ تو ذرا تازہ دم ہونے کے بعد احباب ہمارے کمرے میں آجاتے تھے۔ آدھی آدھی پیالی چائے کا ایک آدھ دور چلتا تھا اور اس کے ساتھ ہلکی پھلکی، بے مغز اور سطحی قسم کی باتوں کا دور بھی۔ کبھی کوئی بندھا ٹکا موضوع نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کرکٹ کا ذکر چھڑ گیا تو اس وقت موجود لوگوں نے اس میں حصہ لیا اور کرکٹ کے متعلق ذہن میں بھرے ہوئے فاضل مواد کو جھٹکنا شروع کیا۔ یا پھر فلم کا قصہ نکلا تو حال میں دیکھی گئی کسی فلم کی اسٹوری اور ڈائرکشن سے ہوتے ہوئے ایکٹروں اور ایکٹریسوں

کے خفیہ رازوں سے پردے اٹھائے جاتے۔ زیادہ باتیں سیاست پر ہوتی تھیں۔ سیاست کہئے تو یہی خبریں جو روزانہ اخبارات میں چھپتی تھیں۔ یعنی منسٹروں کی اٹھا پٹخ، کسی کے سرکاری مکان کے کرائے کی باقی رقم یا کسی گھپلے کی خبر۔ کچھ باتیں شہر میں ہونے والی چوری، ڈکیتی یا معمولی باتوں پر ہونے والے جان لیوا جھگڑوں کے سلسلے میں بھی ہوتی تھیں۔

لیکن ان سب میں جو اہم موضوع ہوتا تھا۔ وہ دنگے فساد کا موضوع تھا کیوں کہ کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا جب کسی نہ کسی شہر میں کسی نہ کسی قسم کا فساد نہ ہوتا ہو اور جس میں دو چار افراد کے مارے جانے، ان سے زیادہ کے زخمی ہونے اور لاکھوں کی املاک کے لوٹے یا جلائے جانے کی خبر نہ ہوتی ہو۔ اس لئے ہم لوگوں کی زیادہ توانائی اور وقت اسی دلخراش موضوع پر بحث کرنے میں صرف ہوتا تھا۔

فسادات کا موضوع جب چھڑتا تھا تو لامحالہ لہجہ ترش اور آواز زوردار ہو جایا کرتی تھی۔ میں احباب کے جوش اور جذباتیت کو کم کرنے کے خیال سے فسادات کے سماجی، سیاسی اور معاشی اسباب بیان کرنے لگتا تھا۔ یہی کہ سیاست داں اپنی ساکھ بڑھانے یا اپنے حریف کو زک پہنچانے یا ایک فرقے کی زمین جائیداد کو ہڑپنے کے لئے یہ گندہ کھیل کھیلا کرتے ہیں۔ احباب ہماری دلیل سے تو اتفاق کرتے تھے، مگر وہ کچھ زیادہ ہی تیز بلکہ شکوہ کناں لہجے میں یہ کہنے لگتے تھے کہ پھر حکومت اور اس کے عملے غیر جانبداری اور انصاف پسندی سے کام کیوں نہیں لیتے۔ ایک ہی فرقے کے افراد پر مظالم کیوں ڈھاتے ہیں۔ ہم سے دشمنوں جیسا برتاؤ کیوں کرتے ہیں۔ ان کی اس جائز شکایت سے کوئی اختلاف کر سکتا تھا اور نہ تشفی بخش جواب دے سکتا تھا۔ انہیں چپ کرانے کے لئے میں یہ عذر پیش کرتا تھا کہ بھائی اسی مکان میں مالک بھی رہتا ہے۔ اس کی مجبوری یا ہماری ضرورت پر ترس کھا کر اس نے ایک کمرہ ہمیں الاٹ کر دیا ہے۔ ہم لوگوں کے بحث مباحثہ سے اگر اس کے آرام میں خلل پڑے گا تو کسی دن وہ مجھے کمرہ خالی کرنے کا حکم صادر کر دے گا۔

جو لوگ کسی دلیل سے چپ نہیں ہوتے تھے وہ ہماری اس عاجزانہ درخواست پر ایک دم سے دم سادھ لیتے تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ مالک مکان سے ہماری ابھی زیادہ رسم و راہ نہیں ہوئی تھی۔ بس آتے جاتے دعا سلام ہو جاتی تھی اور رسماً ایک دوسرے کی خیریت خیر صلا پوچھ لیتے تھے۔

مگر اس سارے بحث مباحثہ کے دوران مالک مکان کا ایک عجیب و غریب ملازم جب وہاں مسلسل کھڑا دکھتا تھا تو بظاہر وہ ہماری گفتگو سنتا تھا مگر اس کا جو حلیہ تھا اسے دیکھ کر مجھے وہ خاصا گھنا

شخص نظر آتا تھا۔ جس بات کا اس سے کوئی تعلق اور نہ جس کی اسے تمیز اسے اس قدر انہماک سے سنتے دیکھ کر ہمیں شبہ ہوتا تھا کہ وہ اصل میں اپنے مالک کی طرف سے ہم لوگوں کی جاسوسی کرتا ہے۔

اسے ہم نے جو عجیب و غریب کہا تو بلا وجہ نہیں کیونکہ ایک تو اس کا قد ڈیڑھ بالشت کا تھا مگر داڑھی اپنے قد سے بھی زیادہ بڑھا رکھی تھی اور باوجود اس کے کہ وہ کھڑاؤں پہنے رہتا تھا۔ مگر ہمارے دروازے پر اس قدر دبے پاؤں آکر کھڑا ہو جاتا تھا کہ اس کے جاسوس ہونے پر کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی تھی۔

اس پر نظر پڑتے ہی ہمارے سب دوست محتاط ہو جاتے تھے اور میں اسے اپنے طور پر رشوت دینے کے لئے پوچھتا تھا ''کیا سعید بھائی چائے چلی گی؟''

پھیکی سی مسکراہٹ کے علاوہ وہ کوئی جواب دیئے بغیر فوراً مالک کی کیتلی لے آتا اور پیسے لے کر نیچے ہوٹل سے چائے لانے چلا جاتا تھا۔ چائے لے کر وہ اس قدر جلد لوٹتا تھا کہ جواب نہیں۔ ہاں لکڑی کے زینے پر اس کے کھڑاؤں کی کھٹ پٹ سنتے ہی ہم لوگ سنجیدہ ہو جاتے تھے۔

یہ پابندی اور احتیاط دیکھ کر ایک دن ایک دوست تاش کی گڈی لے آیا، تو میں نے تاش کھیلنے کی بھی اجازت نہیں دی کیونکہ میں جانتا تھا کہ تاش کھیلنے والے کچھ زیادہ ہی شور کرتے ہیں اور اس کھیل میں وقت کے گزرنے کا بالکل اندازہ نہیں ہوتا۔ تب فیروز جس کی مالی حالت ہم لوگوں سے کچھ بہتر تھی، ایک دن کیرم بورڈ خرید لایا۔ یہ کھیل بڑی احتیاط اور خاموشی سے کھیلا جاتا۔ پھر بھی گوٹوں کی کھٹ کھٹ تو ہوتی ہی تھی۔ اور ایسے میں بھی سعید جب مسکینوں کی طرح کھڑا ہوتا تھا تو ہمیں لگتا تھا کہ وہ یہ شکایت کرنے آیا ہے کہ ہم لوگ اس کے مالک کے آرام میں خلل پہنچا رہے ہیں۔ اس لئے کیرم کا کھیل بھی بند کر دیا جاتا اور سعید کو رشوت دینے کے لئے چائے کا ذکر چھیڑا جاتا۔ سعید ہاں نہیں کچھ بھی نہیں بولتا، بس کیتلی لے کر حاضر ہو جاتا۔

گویا ہم نے اپنے آرام کے لئے دوستوں کی زبان پر پہرہ بٹھا دیا اور دوستوں نے بھی اپنے لب سی لئے۔ بس سرگوشیوں میں باتیں کرتے تھے لیکن سعید کا مسکینوں کی طرح آ کھڑا ہونا موقوف نہیں ہوتا تھا۔ وہ کچھ بولتا بالتا تو تھا نہیں کہ اس کا عندیہ ہم لوگوں پر ظاہر ہوتا۔ تاہم اسے رشوت دینے کے خیال سے چائے کی خواہش ظاہر کرتے تھے تو وہ کسی پس و پیش کے بغیر چائے لانے چلا جاتا تھا۔

غرض یہ کہ زندگی اس ڈھب سے گزر رہی تھی کہ ایک دن بڑا غضب ہو گیا۔ مالک مکان خود ہمارے کمرے میں جو اصل میں اسی کا کمرہ تھا، اس طرح چلا آیا جیسے کسی ٹوہ میں ہو۔ وہ جب

ہمارے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا تو ہم نے دل کڑا کر کے اسے بیٹھنے کو کہا۔

وہ بیٹھ تو گیا مگر مسکراتا ہوا اور پھر پوچھنے لگا۔

"آج کل آپ لوگوں کی محفل نہیں جمتی؟"

مارے اندیشے کے ہم نے ایک جھوٹ گھڑا۔

"اصل میں نئے نئے تھے تو لوگ آجاتے تھے۔ اب سب اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔" لیکن اس کے بشرے سے جھلک رہا تھا کہ اسے ہماری باتوں پر یقین نہیں آیا ہے۔ وہ بولنے لگا۔

"آپ ان لوگوں کو بلائیے۔ آپ لوگوں کی باتیں میں بھی سنا کرتا تھا۔ ماسٹر ظہور عالم کے کہنے پر یہ کمرہ آپ کو ہم نے اس لئے دیا ہے کہ کچھ ہم زباں اکٹھا ہوں، ورنہ یہ خالی دن اور خالی راتیں کاٹے نہیں کٹتی ہیں۔"

میں نے حیرت اور تجسس کا انداز اختیار کیا تو انہوں نے لمبی اور ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بڑے دکھی دل سے سنایا کہ " آپ کی دعا سے میں شہر کا ایک بڑا کاروباری تھا۔ اس علاقے میں ہائڈ اینڈ اسکن کا دھندا تھا جسے خدا نے اتنی ترقی دی کہ اپنی ٹینری بھی لگائی۔ مگر ہمیں ترقی راس نہیں آئی۔ جانے ہم پیشہ لوگوں کی نظر لگی یا آسمان کو ہماری خوشحالی نہیں بھائی حالانکہ اپنی کاروباری ترقی کے ساتھ میں نے اپنا رویہ نہیں بدلا تھا۔ یہ تو ہمارا خیال ہے۔ کیا پتہ خدا کو ہماری کونسی بات بری لگی کہ آج سے چار سال پہلے یہاں جو فرقہ وارانہ فساد ہوا اس میں کارخانہ جل کر راکھ ہو گیا۔ انشورنس کی جو تھوڑی بہت رقم ملی اس سے میں دو چار پیس چمڑے خرید کر تگڈم تگڈم زندگی کی گاڑی کھینچ رہا ہوں۔

اتنا بڑا نقصان اٹھانے والے کا بجھ جانا فطری تھا مگر اس کے لہجے کی گہری اداسی پر مجھے اور تشویش ہوئی کہ کہیں اس بیچارے کے بیوی بچوں پر بھی قیامت تو نہیں ٹوٹی؟ اس لئے ڈرتے ڈرتے میں نے پوچھا۔

"کوئی جانی نقصان وغیرہ تو۔۔۔؟"

اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"جانی نقصان تو نہیں۔ ۔۔ مگر بیوی بچوں کو میں نے وطن واپس بھیج دیا۔ آپ کو کیا بتاؤں کہ یہاں کتنی چہل پہل رہتی تھی۔ بیوی بچوں کے علاوہ بیوپاریوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ سب سے آخر میں وہ جو بڑا کمرہ ہے اسے میں نے بیوپاریوں کے لئے مہمان خانہ بنا دیا تھا۔

مگر جب یہ سارا سلسلہ ختم ہو گیا تب زندگی میں بڑی ویرانی آ گئی۔ اب کسی بات میں جی نہیں لگتا۔ یہ سعید جو پکا دیتا ہے وہ کھا لیتا ہوں۔ بس یہ سمجھئے کہ زندگی کے باقی دن پورے کر رہا ہوں۔"

"نہیں، ایسا کیوں کہتے۔۔۔ آپ جوان آدمی ہیں حوصلہ رکھئے۔"

موقع غنیمت جان کر سعید کے بارے میں پوچھ لیا تو ہمارے مالکِ مکان رفیع اللہ صاحب نے جو قصہ سنایا وہ بہت ہی رقت انگیز تھا۔ انہوں نے بتایا کہ سعید کا باپ ان کا بہت ہی معتمد آدمی تھا۔ وہی کارخانہ کی نگرانی کرتا تھا اور اپنی بیوی اور سعید کے ساتھ کارخانے ہی میں رہتا تھا۔

سعید اس کا اکلوتا مگر بڑا نٹ کھٹ اور چونچال لڑکا تھا۔ اب اسے دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا کہ یہ وہی لڑکا ہے۔ جس وقت فساد ہوا اور ہماری ٹینری پھونکی گئی یہ لوگ معمول کے مطابق وہیں تھے۔ سعید کے باپ نے جان پر کھیل کر ہماری ٹینری بچانے کی کوشش کی مگر بلوائیوں نے ہماری ٹینری کے ساتھ سعید کے باپ ماں کو بھی ختم کر دیا۔ خدا کی شان کہ یہ لڑکا بچ گیا۔

صبح کو جب پولس آئی تو یہ سامنے آیا اور ماں باپ کے تنِ مردہ کو دیکھ کر پچھاڑ کھانے لگا۔ مگر پولس والے اس کے ساتھ کوئی ہمدردی کیا کرتے اسے مجبور کیا کہ والدین کی لاشیں ٹرک پر ڈالے۔

اس کے بعد تو سعید کے جیسے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے جو چپ سادھی تو لاکھ پوچھنے پر بھی کچھ نہیں بولتا تھا۔ ہمیں اپنی ٹینری کے ساتھ اس کی حالت دیکھ کر بڑا ترس آتا تھا مگر اپنے بس میں کیا تھا۔ اللہ بھلا کرے ظہور عالم صاحب کا کہ انہوں نے اسے نارمل بنانے کی انتھک کوشش کی۔ اسے پڑھانا لکھانا چاہا۔ پڑھ لکھ کر تو اس نے نہیں دیا۔ البتہ نماز وغیرہ سیکھ کر پنج وقتہ نمازی بن گیا ہے اور داڑھی بھی بڑھالی ہے۔ ہم نے بھی اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے کیونکہ آپ بھی دیکھتے ہی ہیں کہ نارمل وہ ابھی بھی نہیں ہوا ہے۔

رفیع اللہ صاحب کی باتیں سن کر میں نے رنج کا اظہار کیا تو انہوں نے بڑی بے پروائی سے اس موضوع کو بدل دیا اور یہ تقاضہ کرنے لگے کہ اپنے دوستوں کو بلائیے۔

اس کے بعد ہم لوگوں کی بیٹھک ہمارے کمرے میں نہیں بلکہ رفیع اللہ صاحب کے مہمان خانے میں ہوتی تھی جہاں اگلے وقت کے موٹے موٹے گدے اور تکئے اور گاؤ تکئے لگے ہوئے تھے۔ چائے بھی اب ہوٹل سے نہیں آتی تھی بلکہ سعید وہیں تیار کیا کرتا تھا۔ غرض یہ کہ موج ہی

موج تھی۔ اور اچھی بات یہ تھی کہ رفیع اللہ صاحب بھی خوش رہنے لگے اور سعید کے چہرے پر پھیلی مسکینی بھی ختم ہونے لگی اور کبھی ہلکی سی مسکراہٹ کھیل جاتی تھی۔

ایک دن ایسا ہوا کہ موٹے گدے کے نیچے لوہے کی کوئی موٹی سی سلاخ کھڑ کھڑائی۔ اسے باہر نکال کر دیکھا جارہا تھا کہ رفیع اللہ صاحب نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا "اسے وہیں رہنے دیجئے ۔۔۔ وہیں۔"

اسے وہیں رکھ تو دیا گیا مگر اس کی حقیقت معلوم کی گئی تو انہوں نے پھر ایک غمناک قصہ سنایا۔

قصہ یہ تھا کہ یہ سعید کے والد کا آہنی ڈنڈا تھا جسے وہ بے چارا میٹری میں رات کو پہرہ دیتے وقت زمین پر پٹخ کر ٹھن ٹھن بجاتا اور چور اچکوں کو اپنے جاگے ہونے کی آگاہی دیتا تھا۔ سعید باپ کے قیمتی ورثہ کی طرح اس سلاخ کو اپنے ساتھ لے آیا تھا اور اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر وہ جو انگریزی میں کہا جاتا ہے کہ آدمی منصوبے پر منصوبے بناتا ہے اور خدا اس میں کھنڈت پر کھنڈت ڈالتا جاتا ہے تو صحیح ہی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ آسمان کے پاس زمین کے خدا کو ہم لوگوں کی خوشی نہیں دیکھی گئی۔ جب ہی تو اس کاسموپلیٹن شہر میں فرقہ وارنہ فساد کے شعلے پھر بھڑک اٹھے بلکہ اس بار کچھ عجیب طریقے سے بھڑکے۔

عجیب طریقے سے مراد یہ کہ اب کے بلوائی صرف ان مقامات پر زور نہیں دکھا رہے تھے جہاں مسلمانوں کی ان گنی آبادی یا چند دکانیں تھیں بلکہ بیچ شہر میں بھی اودھم مچانے لگے تھے۔ حتیٰ کہ خالص مسلمان محلوں میں بھی شیر بنے گھسے آتے تھے۔ وہ بھی سپاہیوں کی نگرانی اور دن کے اجالے میں جیسا کہ عام طور پر ہر شہر میں ہے کہ مسلمانوں کے محلے میں زیادہ تر کچی اور خستہ عمارتیں ہوتی ہیں۔ سو ہم بھی جہاں رہ رہے تھے وہاں کا یہی حال تھا۔ بلوائیوں نے ان مکانات پر آگ کے جلتے گولے پھینک کر ان ڈھانچوں کو جو مکان کہلاتے تھے، خاکستر کرنا شروع کر دیا تھا۔ جلتے مکانوں سے سارے لوگ چوہوں اور کیڑے مکوڑوں کی طرح بلبلا بلبلا کر نکلتے تھے۔ مگر نہ پولس بلوائیوں کو روکتی تھی اور نہ ہی دمکل والے بھاگ کر آتے تھے اور جو آجاتے تھے تو تنگ گلیوں اور پانی کی کمیابی کی بنا پر خاموش تماشائی بنے رہتے تھے۔

ستم تو یہ کہ ایک روز دن دہاڑے بلوائی اس محلے میں بھی در آئے اور حد یہ ہوئی کہ پولس ان کے آگے آگے تھی اور بلوائی ان کے پیچھے پیچھے۔ یہ ہر طرف جلتی مشعلیں اور بم پھینک رہے

تھے۔ انتہا یہ ہوگئی کہ بلڈنگوں کو بھی جن میں عام طور پر معزز شہری رہتے ہیں، نہیں بخشا جارہا تھا۔ تب ہم لوگوں کے اوسان خطا ہوئے کہ پرانے وقت کی ان بلڈنگوں کے زینے، شہتیر اور ریلنگ زیادہ تر لکڑی ہی کہ تھے۔ پٹرول اور مشعل کے سامنے ان بلڈنگوں اور ان کے مکینوں کا اور برا حال ہوگا۔ زینوں کے جل جانے پر یہ نکل بھی تو نہیں سکتے تھے۔ ہاں جل جھلس کر ضرور رہ جاتے۔

یوں سمجھئے کہ قیامت کا سماں تھا اور کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ نہ سرکار اور نہ سرکار کے محافظ عملے۔ عملے تو ایک لحاظ سے بلوائیوں کے موسیرے بھائی بن گئے تھے۔ ایسے میں صرف ایک نوجوان آگے بڑھا اور اس نے پولس والوں کو ان کا فرض یاد دلانے کی جسارت کی تو پولس نے گولی چلائی ضرور مگر بلوائیوں پر نہیں بلکہ اس ڈھیٹ نوجوان پر۔ اپنی بالکنی پر سے ہم نے دیکھا کہ اس نوجوان کو پوائنٹ بلینک گولی ماری گئی اور وہ ادھ کٹے مرغے کی طرح تھوڑی دور چل کر زمین پر گر پڑا۔

یہ دلدوز منظر دیکھنے کے بعد مصلحت کا تقاضا تھا کہ ہم بلا تاخیر بالکنی سے ہٹ کر کمرے کے اندر آجائیں اور دروازے کھڑکی بند کرلیں حالاں کہ آگ اور گولی کے سامنے لکڑی کے دروازے اور کھڑکی سے کیا بچاؤ ہوجاتا۔ تسلی کی بات الگ ہے۔ لیکن دروازہ بند کرنا بھی مشکل ہوگیا کیونکہ چھوٹے قد کا سعید بالکنی ہی پر اٹکا رہ گیا تھا۔ ہم لوگوں نے بہت زور لگا کر اسے اندر گھسیٹا تو وہ پورے دھڑ سے کانپ رہا تھا۔ جو کسی کو پولس کی گولی کھاتے دیکھنے کا فطری رد عمل تھا لیکن یہ بالکل سمجھ میں نہیں آیا کہ سعید کی آنکھوں میں اس قدر سرخی اور بلا کی تندی کیوں آگئی تھی؟

دو دنوں تک ہم لوگوں کو جس عذاب سے گزرنا پڑا وہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ بس تن بہ تقدیر بیٹھے رہتے تھے اور وقفہ وقفہ سے خدا کو یاد کرکے خود کو اس کی مرضی کے حوالے کرتے رہتے تھے۔ ایسے میں سعید جو کچا پکا تیار کردیتا اسے صبر و شکر کے ساتھ کھالیتے تھے۔ ہاں کبھی کبھار چائے فرمائش کرکے بنواتے تھے تو چائے میں پہلے جیسا مزہ نہیں ملتا تھا۔ جیسی بھی مل جاتی تھی غنیمت تھی۔ ذہنی انتشار اور دل کی بے قراری میں مزے اور لطف کا خیال کسے آتا ہے۔ خاص کر اس شخص کو جو دنیا جہان سے کٹا جنگی قیدیوں کی طرح دن گذار رہا ہو۔ اور باہر کی دنیا سے قطعی بے خبر اور ناواقف ہو۔ اخبارات میں نہایت مبہم اور غیر تسلی بخش خبریں ہوتی تھیں۔ کسی کو فون کرکے کچھ معلوم کرنا چاہتے تو فون ڈیڈ ملتا یا ادھر کوئی جواب دینے والا نہیں ہوتا۔ مدھم آواز میں ملکی اور غیر ملکی ریڈیو سنا کرتے تھے۔ مگر ایسی کوئی خبر نہیں ہوتی جس سے دل کو سکون ملے۔

اس لئے نڈھال، نیم مردہ سے، ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہم ہوگ بیٹھے رہتے تھے تیسرے

دن ایسی خبر ملی جس سے کچھ ڈھارس بندھی۔ معلوم ہوا کہ مرکزی وزیر داخلہ نے آکر سخت کارروائی کی ہے۔ عملوں کو چست بنایا ہے اور مقامی ذمہ داروں کی مدد کے لئے سی آر پی اور بی ایس ایف کے جوانوں کی بھاری جمعیت بلالی ہے۔

اس انتظام کے بعد شہر کی حالت میں کیا فرق آیا اس کے بارے میں تو کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ کیونکہ بازار اور دفتر ہر جگہ آنا جانا بند تھا۔ ہاں ہم لوگوں کے رگ پٹھوں میں کچھ جان سی آگئی اور کبھی کبھی لبوں پر پھیکی اور بے جان سی مسکراہٹ بھی پھیل جاتی تھی۔ نفسیاتی تناؤ میں جو کمی آئی تھی اس کا صحیح اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ سعید کو بہت اچھی چائے بنانے کو کہا گیا اور ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول کر باہر بھی دیکھا تو ہر طرف وردی پوش جوان اس طرح تعینات نظر آئے جیسے کسی مفتوحہ علاقے میں سینہ پھلائے کھڑے ہوں۔ خیر جوانوں کا جو بھی انداز تھا اُس پر مجھے یا کسی اور کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ البتہ اس وقت جوانوں کے نرغے میں ہم نے جو منظر دیکھا تو اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔ دیکھا یہ کہ سعید چائے کی کیتلی لئے کھڑاؤں کھٹ کھٹاتا ہوٹل کی طرف چلا جارہا تھا۔ حال یہ تھا کہ میں اسے آواز دے سکتا تھا اور نہ تالی ہی بجا کر اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا۔ ان حالات میں سعید کے اس فعل کو سرفروشی تو کہا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ اس جمہوری نظام میں اس طرح ہتھیلی پر سر لے کر چلنا بھی مناسب نہیں تھا۔ کیونکہ یہ تو صریحاً جان پر کھیلنے جیسا عمل تھا۔ چٹکی بجا کر ہم نے رفیع اللہ صاحب کو بھی بالکنی پر بلا کر یہ نقشہ دکھایا تو ان کی بھی سانسیں رک گئیں۔

سعید چائے لے کر جب واپس آیا تو ہم لوگوں نے اس کی فہمائش کی مگر اس نے سر ہلا کر اس طرح شکل بنائی جیسے اسے ان باتوں کی کوئی پرواہ نہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وزیر داخلہ کے آنے سے پہلے بھی وہ ہوٹل ہی سے چائے لا تا رہا تھا۔

خیر تو حالات اس کے بعد اور بہتر ہونے لگے۔ وزیر اعلیٰ نے بھی فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا اور صرف دورہ ہی نہیں کیا بلکہ مرنے اور زخمی ہونے والوں کو موٹی موٹی رقم دینے اور فسادی عناصر کو کچل دینے کا بھی اعلان کیا۔

وزیر اعلیٰ کے جانے کے بعد اکادکا لوگ گھروں سے نکلنے لگے مگر اس طرح ڈرے سہمے کہ کسی تاکید اور تقاضے کے بغیر سر جھکائے اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے گزرتے اور کسی بھی وردی پوش کو سلام اور بندگی عرض کرنا نہیں بھولتے تھے غرضیکہ حالات ایسے تھے جسے سرکاری اصطلاح میں قابو میں کہا جاتا ہے۔

ہم لوگ بھی چین کی سانس لینے لگے تھے کہ ایک دن بیٹھے بٹھائے ایک دھماکہ ہوا۔

ابھی پولس کا پہرہ لگا ہی ہوا تھا کہ کسی کے چیخنے چلانے کی آواز آئی۔ کان کھڑے کئے تو پتہ چلا کہ یہ آواز کہیں پاس ہی سے آ رہی تھی۔ نزدیک کہئے تو عمارت کے اسی حصے اور فلور پر سے جہاں ہم لوگ رہتے تھے۔ حواس باختہ سے باہر آئے تو ظاہر ہوا کہ رفیع اللہ صاحب کے مہمان خانے ہی میں تانڈو ناچ ہو رہا ہے۔ وہاں پہنچ کر ہم لوگوں نے دیکھا کہ سعید اپنے باپ کی آہنی سلاخ لئے، اندھا دھند بھانج رہا ہے اور کبھی تکیہ کو پیٹتا ہے اور کہتا ہے کہ "سالا اور لگا آگ اب پھینک بم اور گاؤ تکیہ کو دھنکتا ہے کہ تو سالا سپاہی بنا ہے، گولی چلاتا ہے، چلا ہم پر گولی"۔

سعید پر جیسے ایک جنونی کیفیت طاری تھی جس کے زیر اثر وہ سلاخ بھانج رہا تھا اور اس کے منہ سے کف جاری تھا۔

اس کے طیش اور دبے جذبات کے ابلتے لاوے کو دیکھ کر ہم لوگ دم سادھے بالکل اس طرح کھڑے تھے جیسے سینما کے کسی منظر کو فریز کر دیا جاتا ہے اور کردار آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے بے حس و حرکت نظر آتے ہیں۔

اکھوا

ریلوے کے پیدل پل پر چڑھ کر نصرو نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو نقشہ ہی کچھ اور نظر آیا۔ اس نقشے کو دیکھ کر اس کا دل خوشی سے بھر گیا۔ سچ پوچھا جائے تو بمبئی آنے کے بعد آج اسے دوسری بار اتنی خوشی حاصل ہوئی تھی۔ خوشی کیوں ہو رہی تھی نصرو پر یہ نکتہ واضح نہیں تھا۔ اسے بس دوسری بار خوشی حاصل ہو رہی تھی۔ حالانکہ یہ خوش ہونے کا کوئی موقع نہیں تھا۔

چار سال پہلے وہ علی گڑھ میں، اپنے گھر میں رہتا تھا۔ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اس کا گھر چھوٹا تھا۔ مگر اپنا تھا جہاں ابا روزانہ شام کو واپس آتے تھے تو وہ اور اس کی چھوٹی بہن ان سے لپٹ جایا کرتے تھے اور ابا یونہی۔۔۔ ارے چھوڑو بھی۔۔۔ ہٹو بھی۔۔۔ کہتے رہتے تھے مگر وہ لوگ نہ ہٹتے تھے اور نہ ہی ابا چاہتے تھے کہ وہ لوگ ان سے الگ ہو جائیں۔

لیکن پھر ایسا ہوا کہ علی گڑھ میں رائٹ ہو گیا۔ رائٹ وائٹ کیا ہوتا ہے یہ بات نصرو نہیں سمجھتا تھا۔ البتہ یہ دیکھتا تھا کہ کئی دن ابا دکان کھولنے نہیں جاتے۔ محلے کے دوسرے لوگ بھی گھر ہی پر رہتے۔ ایک دن ابا گئے بھی تو فوراً ہی پلٹ آئے۔ وہ بہت پریشان تھے۔ پتہ چلا کہ فسادیوں نے دکان میں آگ لگا دی۔۔۔ کسٹمرز کے سلے اور بن سلے کپڑے اٹھا لے گئے۔ ساتھ ہی سلائی کی دونوں مشینیں بھی۔

اس کے بعد پھر ابا وہاں نہیں رہے۔ بمبئی چلے آئے۔ سال میں ایک بار گھر آتے تھے تو نصرو اور اس کی بہن ان سے چپٹے رہتے تھے۔ وہ بھی سبھوں کو ساتھ لئے چلتے تھے۔۔۔ آخری بار گئے تو کہا کہ تین ہزار روپے دے کر بمبئی میں جگہ مل گئی ہے۔ اب کے سب چلے چلو۔

علی گڑھ اور بمبئی میں کیا فرق تھا اور کیا نہیں تھا یہ بھی نصرو کو معلوم نہیں تھا۔ اسے تو بس اس بات کی خوشی تھی کہ اب ابا سے الگ نہیں رہنا پڑے گا بلکہ پہلے کی طرح ساتھ رہیں گے۔ ہر وقت۔ ہر گھڑی۔

بمبئی آن کر نصرو جب اس بستی میں پہنچا جو تختوں، کنستر کے چدروں یا بوریوں سے بنی چھوٹی چھوٹی جھوپڑیوں پر مشتمل تھی اور جہاں گندے نالے بہتے تھے، فضا میں ہر وقت بدبو رچی ہوتی

تھی اور دن کو بھی مچھر ٹوٹے پڑتے تھے تو نصرو نے کچھ کہا تو نہیں کہ اس وقت اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اسی گندی جگہ رہنا ہے اور اتنی تنگ سی جھوپڑی کے لئے ابا کو تین چار ہزار روپے دینے پڑے۔ اس وقت تو اس پر ابا کے ساتھ رہنے کا نشہ طاری تھا۔

دوسری بات یہ بھی ہوئی کہ جس دن وہ لوگ یہاں پہنچے تھے اسی شام کو ابا سب کو سیر کرانے لے گئے تھے۔ یہ لوگ دو منزلہ بس پر سوار ہوئے تو نصرو کو بڑا مزہ آیا۔ خاص کر جب بس ہچکولے کھاتی تھی تو اسے اور بھی لطف آتا تھا۔ جھٹکے کا احساس تو کبھی کبھی ہی ہوتا تھا، ورنہ بس کے آگے اور دائیں بائیں بے شمار کاروں اور موٹر گاڑیوں کو دیکھ کر وہ حیران ہو رہا تھا۔ وہ گننا چاہتا تھا تو گننا محال تھا۔ موٹر گاڑیوں سے نظر ہٹتی تھی تو ایک کے بعد دوسرے مکانات پر نظر پڑتی تھی۔ ابھی وہ ایک مکان کو جی بھر کے دیکھ بھی نہیں پاتا تھا کہ اتنا ہی بڑا دوسرا مکان نظر آجاتا تھا۔ صاف ستھرا اور شیشوں سے سجا سجایا۔ پھر اس نے سمندر جو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اتنا بڑا دریا اس نے کہاں دیکھا تھا۔ نانی کا گھر جہاں تھا وہاں ایک چھوٹی سی ندی تھی جو اس دریا کے سامنے بالکل بچہ تھی۔ یہ سمندر کتنی دور تک پھیلا تھا۔ اس کی موجیں کس قدر شور مچاتی آتی تھیں کہ آدمی دیکھ کر ڈر جائے۔ مگر ابا اسے، اماں کو اور بے بی کو سبھوں کو سمندر کے اندر لے گئے۔ ڈر تو اماں بھی رہی تھیں، نصرو کی کیا گنتی۔ مگر ابا یہ کہتے ہوئے ان سبھوں کو سمندر کے اندر لے گئے کہ ڈرتے کیوں ہو؟ میں ہوں نا۔۔۔ مگر سمندر کی موجوں کو دیکھ کر جو اتنا بڑا منہ پھاڑے چڑھی آتی تھیں۔ اسے ڈر لگتا ہی جا رہا تھا۔

سمندر کے کنارے چاٹ اور آئس کریم اور ہوٹل میں کھانا کھا کر جب وہ لوگ پھر اسی گندی جگہ لوٹے تھے جہاں چھوٹی چھوٹی اور جھکی جھکی جھوپڑیاں تھیں تو وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ ہر سو مچھروں کی بھنبھناہٹ تھی اور جانے کس چیز کی بدبو تھی کہ اچانک نصرو کے پاؤں کیچڑ بھرے ایک گڈھے میں جا پڑے تھے جس میں وہ ڈوبنے لگا تھا کہ ابا نے اسے اوپر اٹھا لیا تھا۔ پاؤں میں کیچڑ لگ جانے پر وہ رونے لگا تھا مگر ابا نے اسے سمجھایا تھا کہ روتے کیوں ہو۔ چلو گھر چل کر دھو لینا۔ اچھا ہوا کہ پہلے ہی دن یہ حادثہ ہو گیا۔ اب تم ہوشیار رہو گے۔

نصرو کی سمجھ میں یہ بات نہیں ائی کہ اس میں ہوشیار رہنے کی کیا بات تھی۔ ہاں اس کیچڑ میں جو بدبو تھی وہ اسے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ ورنہ کیچڑ میں کھیلنے میں تو اسے بہت لطف آتا تھا۔ نانی جب کھڑی چارپائی پر پردے ڈال کر آنگن میں نہاتی تھی تو بہہ کر آنے والا پانی فوراً ہی زمین میں جذب ہونے لگتا تھا اور اس کے بعد جو سوندھی خوشبو پھیلتی تھی تو نصرو بے قابو ہو کر بہنے والے پانی میں قدم تال کرنے لگتا تھا جس پر نانی چارپائی کے پیچھے ہی سے چیخ پکار مچانے لگتی تھی۔۔۔ لیکن گھر

پہنچ کر۔۔ ۔ یہیں اس لکڑے اور ٹین سے بنی جھوپڑی میں پہنچ کر سونے سلانے کی تیاریاں ہونے لگیں تو نصرو بڑی مشکل میں پڑ گیا تھا کہ اتنی سی جگہ میں کون کہاں اور کس طرح سوئے گا۔۔ خیر وہ ابا سے لپٹ کر سو گیا تھا۔ صبح سویرے جو آنکھ کھلی تو اسے یہ دیکھ کر بڑی شرم آئی کہ اماں بھی وہیں پڑی تھیں اور ان کے کپڑے تک درست نہیں تھے۔ بے بی ان کے بازو پر سر رکھے سو رہی تھی۔

ایک ابا کی کشش تھی ورنہ اس گندی گنجان اور گھٹن بھری جگہ میں نصرو کی طبیعت بالکل نہیں لگتی تھی۔ دھیرے دھیرے ابا کے طور طریقے میں بھی تبدیلی آنے لگی تو اس کی طبیعت اور اچاٹ رہنے لگی۔ ابا کافی دیر سے لوٹنے لگے۔ اتنی دیر سے کہ وہ لوگ سو سلا جاتے تھے۔ سو تا وہ ابا کے ساتھ ہی تھا، مگر اب نہ جانے ابا کے منہ سے کیسا بھبھکا آتا تھا کہ نصرو کی طبیعت متلانے لگتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ جان گیا کہ ابا دارو شراب پی کر آتے ہیں۔

بمبئی آکر ابا کیسی بری لائن میں پڑ گئے تھے کہ اماں سے ان کی ہمیشہ کھٹ پٹ ہوتی رہتی تھی۔ مگر ابا پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ رات کو دیر سے اور پئے پلائے لوٹتے تھے۔ اس کی وجہ سے ان لوگوں کی زندگی میں جو بے کیفی پیدا ہو رہی تھی اس کو دور کرنے کا ایک طریقہ تھا کہ نصرو آس پاس کے لڑکوں کے ساتھ گولی کھیلے، لٹو نچائے یا مچھلی پکڑنے کے نام پر کھاڑی کی دلدل کو پھلانگتا پھرے ۔

پر ابا کی یہ تاکید بھی تھی کہ آس پاس کے چھوکروں سے کوئی واسطہ نہ رکھا جائے۔ وہ اماں کو بھی ہدایت کرتے تھے کہ ہر عورت سے واسطہ نہ رکھے۔ خاص کر اس بڑھی سے جو اپنے جھونپڑے میں تنہا ہی رہتی تھی مگر وہاں سارا دن عورتوں اور مردوں کے آنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ یہ زیادہ تر باہر کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ کبھی کبھار پولس کا بھی کوئی آدمی آتا تھا۔ اس علاقے میں کچھ دن رہنے کے بعد نصرو سمجھنے لگا تھا کہ یہ کون لوگ ہوتے ہیں اور بڈھی کس مرض کی دوا ہے۔

جھونپڑپٹی کی یکسانیت اور بے کیفی سے بھری زندگی میں اس وقت ہل چل مچ جاتی تھی جب کوئی جھگڑا ہوتا تھا۔ ویسے جھگڑے اکثر و بیشتر ہوتے رہتے تھے اور ذرا ذرا سی بات پر چھری چاقو اور کبھی پستول نکل آتا تھا۔ تب نصرو کو ابا کی دور اندیشی ماننی پڑتی تھی۔

اس کی اپنی زندگی میں بہار کا ایک جھونکا اس وقت آیا جب اسے اسکول میں داخل کرنے کی بات چلی۔ اس کے لئے یونیفارم بنا اور پھر اس اسکول میں داخل کر دیا گیا جو ریلوے لائن کے پاس تھا اور جہاں ہر وقت گزرتی ریل گاڑیوں کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔

اسکول کارپوریشن کا تھا جہاں سو ڈیڑھ سو بچوں کو پڑھانے والے چار ٹیچر تھے جو پڑھانے کے بجائے گپیں ہانکتے، کان کھجاتے یا آپس میں چندہ کر کے چائے منگوا کر پیتے تھے۔ کلاس میں آتے تو ٹیبل پر پاؤں پھیلا کر لیٹ جاتے تھے اور کسی لڑکے کو بلا کر کہتے تھے کہ سر دباؤ۔

یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر نصرو کا وہ جوش ٹھنڈا پڑنے لگا جو اسکول میں داخل ہوتے وقت پیدا ہوا تھا۔ اب وہ بھی اچاٹ من سے باہر نکل جاتا اور ریلوے کے پیدل پل پر چڑھ کر آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھتا، پلیٹ فارم پر جمع بھیڑ کو تکتا یا کبھی کبھار گزرتی ٹرینوں پر پتھر پھینکا کرتا۔

آج بھی ریلوے کے پیدل پل پر چڑھ کر نصرو نے ادھر ادھر دیکھا۔ لوکل ٹرینیں آ جا رہی تھیں مگر مسافروں سے خالی۔ پلیٹ فارم پر بھی گرمی کی دوپہر جیسا سناٹا تھا۔ چند آدمی نظر آتے بھی تھے تو پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے۔ جہاں پر عورتوں کا ڈبہ لگتا تھا وہیں پر تین چار پولس والے ڈنڈا یا بندوق تھامے بیٹھے تھے۔ ایک آدھ اونگھ بھی رہا تھا۔ انہیں دیکھ نصرو کا خون کھولنے لگا۔

پھر اس نے دوسری طرف دیکھنا شروع کیا۔۔۔ اس طرف جہاں کھاڑی سوکھ گئی تھی اور جدھر سے ہاتھیوں جتنا موٹا پایپ گزرتا تھا اور جس کے پرے ٹوٹی پھوٹی جھونپڑ پٹی تھی۔۔۔ یہ جھوپڑ پٹی ٹوٹ چکی تھی یا جلا دی گئی تھی اور دور سے بے ترتیب لکڑیاں، ٹن اور پولی تھین کے جلے ٹکڑے نظر آ رہے تھے۔۔۔ نصرو اسی جھوپڑ پٹی میں رہتا تھا۔ اسے جھلسی اور ویران دیکھ کر اسے خوشی ہوئی۔۔۔

ادھر اس نے سنا تھا کہ سرکار جھوپڑوں کی جگہ مکان بنا کر دے گی۔۔۔ جھوپڑ پٹی کے باہر بلڈنگیں نظر آ رہی تھیں۔ آج سے پہلے نصرو نے ان بلڈنگوں کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ جھوپڑ پٹی سے باہر جاتا بھی کہاں۔۔۔ مگر آج ان بلڈنگوں کو دیکھ کر اسے بے حد خوشی ہوئی اور دل کے گوشے میں یہ ارمان جاگا کہ سرکار شاید ویسی ہی بلڈنگیں بنا کر دے۔۔۔ ورنہ جھوپڑ پٹی میں رہتے رہتے وہ اوب چکا تھا۔

ابا کے منع کرنے کے باوجود وہ وہاں کے اکثر لوگوں کو پہچاننے لگا تھا۔ اسکول سے نکل کر ریلوے پل پر بھی جب طبیعت نہیں لگنے لگی تب وہ اسکول کے ایک لڑکے کے ہمراہ جو اسی جھوپڑ پٹی میں رہتا تھا ادھر ادھر مٹر گشتی کرنے لگا۔۔۔ مٹر گشتی بھی کہیں اور نہیں۔۔۔ جھوپڑ پٹی ہی میں۔۔۔ وہ لوگ اکثر سوشیل کلب میں جا کر کیرم کھیلتے۔ کلب کے باہر بساط بچھی رہتی تھی اور کرایہ پر کیرم مل جایا کرتا تھا۔ اندر تاش کھیلا جاتا تھا۔ ان لوگوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی مگر رفتہ رفتہ نصرو سمجھنے لگا تھا کہ اندر کیا ہوتا ہے۔۔۔

بہت ساری باتیں اسے اس لڑکے سے بھی معلوم ہوتی تھیں جس کے ساتھ اسکول چھوڑ کر وہ مٹر گشتی کیا کرتا یا کیرم کھیلا کرتا تھا۔۔۔اسی لڑکے نے اسے بتایا تھا کہ یہ گلو سیٹھ کا کلب ہے۔ گلو سیٹھ کا دارو کا دھندہ بھی ہے۔ اس کی دارو اچھی ہوتی ہے اور کم دام پر ملتی ہے۔ اس لئے جگتاپ سے اس کی لڑائی ہوتی رہتی ہے۔ جگتاپ بھی سیٹھ ہے اور اس کا بھی دارو کا دھندہ ہی ہے۔ ان دونوں سیٹھوں کے درمیان اکثر جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ یہ دونوں خود نہیں لڑتے تھے۔ ان کے آدمی لڑتے تھے۔ لڑائی بڑی زور دار ہوتی تھی۔ تلوار اور پستول نکل آتے تھے۔۔۔ اور جب سب کچھ ہو چکتا تھا تب پولس آتی تھی اور جو سامنے آتا تھا اسے پکڑ کرلے جاتی تھی۔

مگر اس بار جانے کیسی لڑائی ہوئی کہ تلوار اور پستول تو نکلے ہی مگر اس کے ساتھ ہی بم اور تیزاب بھی پھینکے گئے۔ جھوپڑوں میں آگ بھی لگائی جانے لگی۔ جو سامنے ملا اس پر حملہ کیا گیا۔ یہاں تک کہ عورتوں اور بچوں کو بھی نہیں بخشا گیا ۔۔۔اور یہ لڑائی کئی دنوں تک چلتی رہی۔۔۔ اور پولس کہیں بھی نہیں دکھائی دی۔

اس کے بعد پورے علاقے میں سراسیمگی پھیل گئی۔ ہر شخص ڈرا اور سہما سا نظر آنے لگا۔ سامنا ہونے پر پھسپھسا کر باتیں کرتا اور پھر ہاتھ اوپر اٹھا دیتا تھا۔

نصرو کے لئے یہ نیا تجربہ تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ جھوپڑپٹی کے لوگ اس قدر افسردہ اور مایوس کیوں تھے۔ پہلے بھی تو جھگڑے ہوتے تھے مگر کوئی فکر مند تو نظر نہیں آتا تھا۔ اس بار تو وہ بڑھی بھی جس سے ہر شخص پناہ مانگتا تھا، ڈری سہمی نظر آتی تھی۔۔۔ وہ اس ادھیڑ بن میں تھا کہ گلو دادا دکھائی دیئے۔ وہ سب کو کچھ سمجھاتے چل رہے تھے۔

ابا کام کرنے نہیں جارہے تھے۔ دوسروں کا بھی یہی حال تھا۔ اور دنوں میں دن کے وقت کوئی مرد دکھائی نہیں دیتا تھا مگر اب تو ہر آدمی گھر ہی پر نظر آرہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے بہت سے لوگوں کو پہلی بار دیکھا تھا۔ بچوں اور عورتوں کو وہ پہچانتا تھا مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ کس کا باپ یا کس کا شوہر کون اور کیسا ہے۔ اس خوف اور دہشت کے عالم میں بھی اسے خوشی ہوئی کہ اپنے کسی پڑوسی کو اپنے کسی دوست کے باپ کو اس نے دیکھا تو سہی۔

شام پڑے پتہ چلا کہ گلو دادا نے کہا ہے کہ آج کچھ زیادہ گڑبڑ ہونے والی ہے۔ پولس والوں نے انہیں خبردار تو کر دیا ہے مگر یہ یقین نہیں دلا سکی ہے کہ وہ کوئی مدد پہنچا سکے گی یا نہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ عورتوں اور بچوں کو ہٹا دیا جائے۔ جوان لڑکے اور مرد پاڑہ ہی میں رہیں گے اور کوئی حملہ ہوگا تو اس کا مقابلہ کریں گے۔

ان باتوں سے عاجز آکر یا شرم کے مارے جب سورج نے اپنا منہ چھپالیا تب ہر جھوپڑے سے عورتوں اور بچوں کی قطار نکلی۔ کسی کے سر پر پھٹے چیتھڑے بستر، کسی کے سر پر ٹوٹے اور شکستہ بکس تھے تو کوئی اسٹوو اور راشن کا ڈبہ اٹھائے ہوئے تھا۔ یہ لوگ جھوپڑپٹی سے نکل کر پائپ لائن کی طرف بڑھے، جدھر دن کے وقت وہ چھوکرے منڈلاتے تھے جنہیں دنیا میں کوئی کام نہیں تھا یا شام پڑے عورتیں لگی جایا کرتی تھیں۔

نصرو کو یاد آیا کہ جب وہ علی گڑھ سے چل کر اس جھوپڑپٹی میں آیا تھا تب شام کے وقت اس کے ابا اماں کو اس طرف لے کر آئے تھے۔ اماں نہیں آنا چاہتی تھیں مگر جانے پھر کیا سوچ کر ادھر آئی تھیں۔۔۔ دو ایک دن کے بعد خود ہی آنے لگی تھیں۔ نصرو کو کرید رہتی تھی کہ اندھیرا ہو جانے پر اماں اس سنسان اور دلدلی علاقے میں کیوں جاتی ہیں۔ ایک دن وہ بھی ساتھ ہو لیا تھا۔ آنے پر اس نے دیکھا تھا کہ ایک اماں ہی نہیں بلکہ دوسری عورتیں اور پھر جوان لڑکیاں بھی تھیں جو کسی جھاڑی یا باتھیوں جیسے موٹے پائپ کی اوٹ میں بیٹھ کر۔۔۔ یہ دیکھ کر نصرو کو پہلے غصہ آیا پھر افسوس ہوا تھا۔ اس کے بعد تو جیسے اس نے کچھ بھی محسوس کرنا چھوڑ دیا تھا اور جھوپڑپٹی کے رہن سہن کا عادی ہو گیا تھا۔

خیر تو اس دن عورتیں، جوان لڑکیاں اور چھوٹے بچے سب ہی کارواں کی شکل میں اس طرف بڑھنے لگے اور ڈرے سہمے پائپ کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ ایسے میں کوئی بچہ کچھ بولتا یا روتا تھا تو مائیں اس کا منہ بند کر کے دعائیں مانگنے لگتی تھیں۔

اس جہنمی جگہ میں وہ لوگ کتنی دیر رہے اس کا اندازہ کسی کو نہیں تھا۔ سب ہی سانس روکے پڑے تھے اور اس بھاری رات کے بخیر و خوبی گزر جانے کی دعائیں مانگ رہے تھے اور رات اس وقت اور بھی سخت اور سنگین ہو جاتی تھی جب پاڑہ سے بندوق چلنے یا بم کے پھٹنے کی آواز آتی تھی۔ ہر گھر کے توانا، تندرست اور کماؤ مرد نگرانی کے لئے وہاں رکے ہوئے تھے اس لئے سب کے ہونٹوں پر مردوں کی سلامتی کی دعائیں تھیں۔

دعاؤں کے باوجود ہوا یہ کہ آگ کے شعلے لپکنے لگے۔ فاصلے کے باوجود شعلوں کی روشنی وہاں تک پہنچنے لگی اور یہاں جتنے بچے، عورتیں اور جاندار تھے وہ سب شکاریوں کی زد میں آئی ہوئی چڑیوں کی طرح پر پھیلا دینے پر مجبور ہو گئے۔

ریلوے پل پر کھڑے کھڑے نصرو نے دیکھا کہ وہ جو دھماکے ہوئے تھے اور شعلے لپکے تھے اس کی وجہ سے ساری جھوپڑپٹی جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ بس کہیں کہیں ادھ جلے تختے، کالے

ہوئے ٹین کے چدرے پڑے تھے اور شعلوں کی لپٹ سے بچ جانے والے پولی تھین کے ٹکڑے گھائل پنچھیوں کی طرح پھڑ پھڑا رہے تھے اور جھوپڑ پٹی سے پرے اجلی، پیلی اور ہری بلڈ نگیں چمک رہی تھیں۔

ایسا ہوا تھا کہ پائپ لائن میں پناہ گزیں انسانوں کے ریوڑ کو ہانک کر ایک عمارت میں لایا گیا۔ یہ عمارت نصرو کے اسکول کی تھی جہاں ہر روز لڑکے اور ٹیچر آیا کرتے تھے۔ مگر آج یہاں بے شمار لوگ آگئے تھے۔ پہلے یہ جگہ نصرو کو کاٹ کھاتی تھی۔ اور آج جب یہاں پریشان اور خستہ حال لوگوں کا جم غفیر تھا تو اس کا دل اور بھی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اسکول کی عمارت میں لوگوں کی چیخ پکار سنتا پھر رہا تھا۔ عورتوں کی آہ و بکا اور بھوکے بچوں کی فریاد سنتا چل رہا تھا۔ مرد سر جھکائے بیٹھے تھے یا بیڑی پھونکتے ہوئے یہ کہتے تھے کہ بلوائیوں کو ہم دیکھ لیتے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ پولس بھی ان ہی کا ساتھ دیتی ہے۔ الٹے ہم پر گولیاں چلاتی ہے۔ ہم اپنے گھروں کی حفاظت کرنے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو ہمارے ہی لوگوں کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔۔۔ کیا کریں۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ داڑھی والے، شیروانی والے اور کھادی والے لوگ تنہا یا ٹولی بنا کر آتے تھے تو یہ لوگ ان کی طرف لپکتے تھے۔۔۔ اپنی فریاد سناتے تھے جسے وہ لوگ بے دلی سے سن کر تسلیاں دیتے اور پھر ان رحم کے طالبوں کے ساتھ فوٹو کھنچوا کر چل دیتے تھے۔

اتنے میں پاشا دکھائی دیا۔ اس کا ہم عمر اور ہم جماعت پاشا۔۔۔ اس نے بتایا کہ بلوائیوں نے اس کی ساری کتابیں جلادیں۔ وہ کتابیں لینے بڑھا تو اسے فٹ بال کی طرح پٹخا اور ٹھکرادیا۔۔۔ اس کے ابا کو پولس پکڑ کر لے گئی۔

تب نصرو کو بھی اپنے ابا کا خیال آیا۔۔۔ وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس ہنگامے میں اسے ان کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ مگر اب ان کی یاد اسے ستانے لگی تھی۔ اسے اپنا ایک پڑوسی نظر آیا۔ اس نے لپک کر ان سے ابا کے بارے میں پوچھا تو پتہ چلا کہ پولس والے اس کے ابا کو بھی پکڑ کر لے گئے ہیں۔ گلو سیٹھ نے انہیں چھڑانا چاہا تو اسے بلوائی بتا کر چھوڑنے سے انکار کردیا گیا۔

یہ سن کر نصرو تڑپ اٹھا۔ وہ اپنے ابا کو چھڑانے تھانہ جانا چاہتا تھا اور اسی کوشش میں ریلوے کے اس پل پر آگیا تھا۔ وہاں آکر پہلے اس نے جلی جھلسی جھوپڑپٹی کو دیکھا تو اسے خوشی ہوئی کہ اب اس گندی جھوپڑپٹی سے نکل سکے گا۔

مگر پھر ابا کا خیال آیا تو وہ بڑا پژمردہ ہوگیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ پلیٹ فارم پر سناٹا تھا۔ لوکل ٹرینیں خالی خالی آجا رہی تھیں۔ پلیٹ فارم پر چند آدمی نظر آتے بھی تھے تو پھونک

پھونک کر قدم رکھتے ہوئے۔۔۔ جہاں پر عورتوں کا ڈبہ لگتا تھا وہاں پر کچھ پولس والے ڈنڈے یا بندوق لئے بیٹھے یا اونگھ رہے تھے۔

پاشا اور دوسرے لوگوں سے پولس کی زیادتیوں کا حال سن کر اسے ان کے پاس جانے کی ہمت تو نہیں ہوئی مگر یہ سوچ کر کہ یہی بدمعاش اس کے ابا کو پکڑ کر لے گئے ہیں، اسے بڑا غصہ آیا۔ وہ اپنے باپ کی گرفتاری کا بدلہ لینے کے لئے مچل اٹھا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور پھر بھاگ کر پل سے نیچے اترا اور پٹریوں پر پڑے پتھر سمیٹ لایا اور وہیں پل پر سے اس نے پولس والوں پر پتھر پھینکنے شروع کر دیئے۔

چیخ

ایکناتھ نے پھر وہی ڈراؤنا خواب دیکھا اور چیخ مار کر اٹھ بیٹھا۔ وہی ڈراؤنا خواب جو اس کی زندگی اجیرن کئے ہوئے تھا۔ جب تک ساتھیوں کے بیچ ہوتا تھا تب تک یا جب تک جاگتا ہوتا تھا سب ٹھیک رہتا تھا لیکن ذرا آنکھ جھپکی نہیں کہ وہی خواب آجاتا تھا۔ ایک ڈراؤنا خواب جس میں وہ دیکھتا تھا کہ بچے والی لڑکی چیختی چلاتی بھاگی چلی جارہی ہے۔ یہ دیکھ کر وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھتا تھا۔ سارے بدن سے کانپتا ہوا اور پسینے میں شرابور۔

یہ خواب وہ اکیلا ہی دیکھتا تھا۔ لڑکی کی چیخ صرف اسے ہی سنائی دیتی تھی یا اوروں کی بھی یہی کیفیت تھی ایکناتھ کو اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔ البتہ اس کی چیخ سارے اسپتال میں گونج اٹھتی تھی۔ کیا پتہ پورے شہر میں اس کی گونج سنائی دیتی ہو لیکن اسپتال میں اس کی چیخ ضرور سنائی دیتی جب ہی تو اس کے ساتھی کانسٹبل جو اسپتال کے پھاٹکوں پر یا دوسری جگہوں پر پہرہ دیتے رہتے تھے، ایکناتھ کی چیخ سن کر بھاگتے ہوئے اس خالی بلڈنگ میں آجاتے تھے جو جانے کب سے خالی پڑی تھی مگر قیامت خیز فساد کے دوران جب مردوں کا انبار لگنے لگا اور مردہ خانے میں گنجائش نہیں رہی تو پوسٹ مارٹم کی جانے والی لاشوں کو اسی بلڈنگ میں رکھا جانے لگا تھا اور جب مردوں کا آنا کم ہوا تو پولس کی ٹکڑی کو اسی خالی مکان میں ٹکا دیا گیا۔

ایسا نہیں تھا کہ ایکناتھ نے کبھی مردوں کو یا چھری کٹار یا بندوق کی گولیوں سے ہلاک ہونے والوں کو نہیں دیکھا ہو۔ پولس کی نوکری میں ایسے موقعے بہت آتے ہیں جس کی وجہ سے آدمی گھبرانے، ڈرنے یا رحم کھانے وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑتا۔

اس کے علاوہ دو چار سال میں ایسے موقعے بھی آتے رہتے ہیں جب ذات پات یا فرقہ اور دھرم کے نام پر دنگے ہوتے ہیں تو مل جل کر رہنے والے لوگ ایک دوسرے کو یا امن و قانون کو باقی رکھنے والی پولس بھی فسادیوں کی آڑ میں جس کو چاہتی ہے موت کے گھاٹ اتارتی ہے۔ تب مردوں کی کچھ کمی نہیں رہتی۔ بعضوں کو نالی گٹر میں بہا دیا جاتا ہے اور کچھ کو پوسٹ مارٹم کرانے اسپتال لایا جاتا ہے۔ ایکناتھ ان سب باتوں سے اچھی طرح واقف تھا۔

مگر اس بار جانے کیا ہوا کہ وہ کمزور اور بھکرے لوگ جو پہلے آسانی سے نشانہ بنتے تھے اور

جن کے گھروں کو لٹیرے اور قانون کے رکھوالے سب مل کر لوٹتے تھے، ایک دم سے تن کر کھڑے ہو گئے اور دنگائیوں کا مقابلہ تو جانے دیجئے پولس والوں سے بھی بھڑ گئے۔ ان کے ہتھیار چھیننے کی کوشش کی اور کئی کو اس دنیا سے چلتا بھی کر دیا۔

ہتھیار بندوق سے لیس ہونے کے باوجود ایکناتھ یہ سب دیکھ کر دہل کر رہ گیا تھا۔ انچارج کے قدموں پر گر کر یہ درخواست کرنے لگا کہ اس کی ڈیوٹی کہیں اور لگا دی جائے۔ پولس کے جو لوگ مارے گئے تھے وہ زیادہ تر ریٹائر منٹ کی عمر کو پہنچے ہوئے ایکناتھ جیسے ہی لوگ تھے اس لیے آفیسر کو اس پر رحم آ گیا اور اس کی ڈیوٹی اسپتال میں لگا دی جہاں مرے یا جلے جھلسے مرد، عورت اور بچے لائے جاتے تھے۔ مرہم پٹی یا پوسٹ مارٹم کے واسطے۔

دنگائیوں کے شکار ہونے والوں کی ڈھٹائی یا اپنے ساتھیوں کی موت کا سوچ کر ایکناتھ کو غصہ تو بہت آتا تھا مگر ان خستہ حال لوگوں کو دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ٹھنڈک پہنچتی تھی۔

لیکن اسے پھر بھی اس بات کا افسوس ہوتا تھا کہ شہر میں جانے کیا کچھ ہو رہا ہے۔ گرچہ اس میں وہ خود شریک ہے اور نہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے بس آنے جانے والوں کی زبانی کچھ سن لیتا تھا کہ ہر طرف مار دھاڑ ہو رہی ہے۔ بستی کی بستی پھونکی جا رہی ہے۔ تلوار اور چھرے سے تو لوگ مارے ہی جا رہے ہیں۔ مکان میں بند کر کے یا پٹرول چھڑک کر زندہ بھی جلائے جا رہے ہیں۔

شہر میں واقعی یہ سب ہو رہا تھا جب ہی تو دن بھر آسمان گاڑھے اور کالے دھوئیں سے ڈھکا رہتا اور رات کے وقت ماحول اتنا ڈراونا ہو جاتا تھا جیسے سارے شہر کو کسی آسیب نے جکڑ لیا ہو۔ نہ چہل پہل نہ چل پوں.... بس مرگھٹ کی خاموشی۔

خوف اور خاموشی کے اس ماحول میں ایکناتھ کا دل بھی ڈوبنے لگتا۔ خاص کر اس وقت جب زخمیوں یا مردوں کو لے کر آنے والے سماج سیوکوں کا سامنا ہوتا تھا جن کے چہرے سے وحشت ٹپکتی تھی اور جو غصے یا صدمے یا چین سکون کے چھن جانے پر کانپتے دکھائی دیتے تھے اور دبے دبے لفظوں میں دنگائیوں اور دنگائیوں سے زیادہ پولس والوں کے ظلم و ستم کی روئداد سنایا کرتے تھے۔

آنے جانے والوں ہی کی زبانی ایکناتھ نے جو کچھ سنا تھا اسے سن کر پہلے تو اسے ایک طرح کا اطمینان ہوتا۔ اطمینان اس وجہ سے کہ اپنے ساتھیوں کے مارے جانے پر اس کے دل میں انتقام کی جو آگ تھی، وہ بجھتی تھی مگر کب تک۔ انتقام کی بھی تو ایک حد ہوتی ہے۔ یہاں تو مار دھاڑ کا سلسلہ بڑا لمبا کھینچا تھا اور اس دوران ایسے ایسے واقعات ہوئے تھے کہ ایکناتھ کے دل میں بھی جس میں کبھی انتقام کی آگ دہکا کرتی تھی ایک ٹیس سی اٹھنے لگتی تھی۔

اس کی حالت تو اس وقت اور بھی غیر ہو گئی جب اس نے سنا کہ خاندان کے خاندان کو ختم کیا جا رہا ہے۔ ضعیفوں کو بخشا جا رہا ہے اور نہ ہی عورتوں اور بچوں کو۔ حد تو یہ کہ بیٹی اور بہن جیسی جوان جہان لڑکیوں کو بے آبرو کیا جا رہا ہے۔

بہت دیر تک تو ایکناتھ کو یقین ہی نہیں آیا کہ لاکھ جنونی کیفیت یا پاگل پن کیوں نہ سوار ہو جائے آدمی اتنا بھی گر سکتا ہے۔ اسے لگتا تھا کہ یہ سب افواہ ہے جس کا عام طور پر ایسے موقعوں پر زور ہوتا ہے۔

مگر اس وقت ایکناتھ کو ایک دھچکے کے ساتھ یہ قبول کرنا پڑا کہ آدمی واقعی کسی بھی قسم کی درندگی کر سکتا ہے جب اس نے ایک لڑکی کو ٹرک سے اترتے دیکھا جو ایک بچے کو سینے سے بھینچے ہوئے تھی اور ہر شخص کو شک بھری نظروں بلکہ انتہائی بے اعتمادی سے دیکھ رہی تھی۔

وہ لڑکی بالکل گندے کپڑے پہنے ... نہیں ان کپڑوں میں خود کو کسی طرح ڈھکے ہوئے تھی۔ اس کی گود کا بچہ تو یہ سمجھا جائے کہ چیتھڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ لڑکی کے بال الجھے ہوئے، گورے چہرہ پر کالک پتی ہوئی اور سرخ آنکھوں میں زمانہ بھر کی وحشت سمائی ہوئی تھی۔ پاگلوں کی طرح ادھر ادھر نظر گھما گھما کر ہر طرف دیکھ رہی تھی جیسے خوف نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا ہو۔

اس لڑکی کو جو لوگ ساتھ لائے تھے وہ بھی بالکل تھکے اور نڈھال سے تھے جیسے لگاتار کڑی محنت اور وہ بھی ناموافق حالات میں محنت کرنے پر آدمی پر طاری ہو جاتی ہے۔ وہ لوگ آپس میں جو ایک آدھ بات کر رہے تھے اس سے ایکناتھ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ کسی کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی ہے اور وہ اپنے خاندان کے ساتھ ایسی جگہ رہتی تھی جہاں صاف ستھرے کپڑے پہننے والے شریف شرفاء ہی رہتے ہیں مگر شریفوں کی وہ جگہ بھی محفوظ نہیں رہی بلکہ وہاں وہ کچھ ہوا جو پسماندہ علاقہ اور انتہائی گھٹیا سماج میں بھی نہیں ہوتا یعنی یہ کہ گھر کے قیمتی سامان لوٹنے کے علاوہ چن چن کر لوگوں کو قتل کیا گیا اور جوان عورتوں اور لڑکیوں کی عزت لوٹی گئی۔ یہ سب سن کر ایکناتھ کا ڈوب مرنے کو جی چاہا۔

غرض یہ کہ اس لڑکی نے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو اپنی آنکھوں سے قتل ہوتے اور جلائے جھلسائے جاتے ہوئے، چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی زندہ آگ میں پھینکے جاتے اور کھلی ادھ کھلی کلیوں جیسی لڑکیوں کو اپنی عزت گنواتے ہوئے دیکھا۔ لیکن پھر بھی خود کو اور اپنے جگر کے ٹکڑے کو بچانے کی سدھ بھی رکھی۔ حالات ایسے تھے کہ بچہ رونے بلبلانے لگتا تھا تب وہ اس کا منہ بند کر کے بھاگتی رہی... بھاگتی رہی۔

سماج سیوکوں کی نظر جب اس پر پڑی تو اس نے انہیں بھی قاتل اور لٹیرا ہی سمجھا اور ان سے بھی بھاگنے لگی۔ لوگوں نے اسے جالیا.... دم دلاسہ دیا... تب بھی لڑکی کو یقین نہیں آیا۔ بالآخر اسے اسپتال لایا گیا۔

ایکناتھ کے لئے اسپتال کی ڈیوٹی کچھ نئی نہیں تھی۔ بیس بائیس سال کی سروس میں وہ زخمیوں کو لے کر بھی اسپتال آیا تھا اور مردوں کو بھی۔ کارونر کورٹ میں بھی وہ ڈیوٹی کر چکا تھا مگر اس بار اس نے ایسے ایسے نقشے دیکھے کہ دہل کر رہ گیا۔ جوان، بچے حد تو یہ ہے کہ بوڑھے پرانے بھی اسپتال لائے جارہے تھے۔ سب ہی بے دردانہ اور غیر انسانی سلوک کی مجسم تصویر تھے۔

مگر یہ لڑکی تو کچھ الگ ہی ڈھب کی تھی۔ فساد میں وہ بچ تو گئی تھی مگر پتہ نہیں کیا کیا جھیل کر بچی تھی کہ بالکل پاگل ہی لگتی تھی۔ حال حلیئے سے بھی اور رویہ سے بھی۔ گندے سندے کپڑے میں لپٹی اور بغل میں کوئی پوٹلی دبائے گاڑی سے اترتے ہی وہ چیخنے لگی کہ مجھے یہاں سے جانے دو۔ میں اسپتال میں نہیں رہوں گی۔ یہ لوگ میرے بچے کو جیتا نہیں چھوڑیں گے۔ میں جانتی ہوں اسپتالوں میں بھی لوگوں کو مارا جاتا ہے۔

اس نے اتنا شور مچایا کہ اسپتال میں ایک طوفان سا آگیا۔ لوگوں نے اسے پکڑنا چاہا تو اس نے بھاگنا شروع کیا۔ جانے کتنے دنوں سے وہ بھاگ رہی تھی اور کہیں اسے پناہ نہیں مل رہی تھی۔ اسے پکڑنے کے لئے ایکناتھ بھی آگے بڑھا اور اسے پکڑ بھی لیا۔ گو اس کی پکڑ مضبوط تھی مگر پھر بھی ہمدردی کا ایک جذبہ تھا۔

پھر ایکناتھ کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی اس لئے نہیں کہ اسے لڑکی پر ترس آنے لگا تھا۔ اس لئے بھی نہیں کہ اس لڑکی کا چہرہ نہایت وحشتناک تھا اور اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے، بلکہ اس لئے کہ اس کے کپڑے، اس کے جسم اور اس کی گود میں بھنچی ہوئی پوٹلی سے بھبھکا سا اٹھ رہا تھا۔ اس بدبو سے ایکناتھ چکرانے لگا۔ ممکن تھا کہ لڑکی آزاد ہو کر پھر بھاگ کھڑی ہوتی۔ کہ اور لوگ بھی آگئے جن میں ڈاکٹر اور کمپونڈر بھی تھے جنہوں نے اسے دور ہی سے شاٹ انجکشن لگادیا۔ انجکشن کے زیر اثر لڑکی پر دھیرے دھیرے غنودگی طاری ہوگئی۔

ہوش میں آتے ہی اس نے پھر اپنے بچے کو ڈھونڈنا شروع کر دیا اور اس کوشش میں اس نے سارے اسپتال کو سر پر اٹھالیا۔ اس کی چیخ سن کر مریضوں، تیمارداروں، ڈاکٹروں اور خود ایکناتھ پر لرزہ طاری ہوگیا۔ "میرا بچہ کہاں ہے؟ میرے بچے کو آخر مار دیا ان لوگوں نے۔" کہہ کر وہ بگٹٹ بھاگنے لگی۔ سب ہی اسے بھاگتے ہوئے دیکھتے رہے مگر اسے پکڑنے کی کسی کو ہمت نہیں ہوئی یا اس کی

ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

بس! فضاء میں ”میرا بچہ... میرا بچہ “کی دلخراش چیخ گونجتی رہی۔

ایکناتھ نے سارا ماجرا اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اپنی آنکھوں سے تو اس نے اور بھی سنگین مناظر دیکھے تھے۔ ابھی جہاں سنتریوں کو ٹکایا گیا ہے اس جگہ کٹی پھٹی اور جلی جھلسی لاشوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا۔ لیکن لڑکی کی دردناک چیخ نے اس کے دل پر جیسا گہرا اثر ڈالا تھا کسی اور واقعہ نے نہیں ڈالا تھا۔ اس واقعے نے تو جیسے اس کی روح کو جھنجھوڑ کر رکھدیا تھا اس لئے سوتے جاگتے یہ دلدوز منظر اس کی نظروں کے سامنے گھومتا رہتا تھا۔ آنکھ جھپکتی تھی تو خواب میں بھی آجاتا تھا۔ ڈراؤنے خواب کی شکل میں، جسے دیکھ کر وہ چیخ اٹھتا تھا اور اس کی چیخ سارے اسپتال میں گونج اٹھتی اور اس کے ساتھی کانسٹبل جو اسپتال کے پھاٹکوں پر یا دوسری جگہوں پر پہرہ دیتے رہتے تھے بھاگتے ہوئے اس کے پاس آجاتے تھے مگر وہ کسی کو یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس لڑکی کی۔ میرا بچہ .... میرا بچہ کی دلخراش چیخ نے اس کے دل پر کیسا گہرا اثر ڈالا تھا کہ کسی اور واقعہ نے نہیں ڈالا تھا۔ اس واقعہ نے تو جیسے اس کی روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کیونکہ ممتا کی ماری وہ لڑکی جس بچے کو ڈھوئے چل رہی تھی وہ منہ بند کرنے سے، دھواں لگنے سے یا دودھ پانی کے بغیر کب کا اس دنیا سے سدھار چکا تھا۔

کٹھن ہے ڈگر

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

انگریزوں کے قبرستان کے پاس پہنچنے پر ایسا لگا کہ لمبا تڑنگا سا کوئی شخص جس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار یا کم سے کم کوئی ڈنڈا تو ضرور تھا، اسے تاک رہا ہے۔ جانے وہ کوئی شخص تھا یا آسیب یا کسی انگریز کا بھوت؟ اسے دیکھ کر اس کے قدم جم کر رہ گئے۔ سانسیں رک گئیں اور حواس نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ اس کے بعد اس نے آگے بڑھنے کے لئے پورا زور لگایا۔ جان کسے پیاری نہیں ہوتی؟

انہی حالات کو دیکھتے ہوئے وہ شام ہونے سے پہلے گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ مگر اپادھیاجی کچھ سننے کو تیار نہیں تھے۔ انہوں نے میٹنگ رکھوادی تھی۔ گرچہ یہ مسئلہ ان کا نہیں تھا مگر اسے وہ ایک انسانی مسئلہ مانتے تھے اور سماج میں جو دراڑ ڈالی جارہی تھی اس سے وہ بہت دکھی تھے۔ اس صورت حال سے نپٹنے کے لئے وہ لڑنا بھی چاہتے تھے۔ اکیلے نہیں سبھوں کو ساتھ لے کر اور اسی مقصد سے انہوں نے یونین ورکرز کی میٹنگ رکھی تھی۔

اندر سے پریشان ہونے کے باوجود وہ میٹنگ میں شریک تو ہوا مگر یہ دیکھ کر اسے بے حد تکلیف ہوئی کہ پہلے جیسی بات بالکل نہیں تھی۔ میٹنگ میں بہت کم لوگ آئے تھے۔ میٹنگ میں کم لوگوں کے شریک ہونے کی ایک وجہ تو یہ ہوگی کہ اس وقت شہر کا ماحول اس قدر خطرناک تھا کہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ کب کس کے ساتھ کیا ہوجائے اس لئے کوئی اپنی جان جوکھم میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اس سے بھی بڑی وجہ یہ تھی کہ آپسی تعلقات میں واقعی ایسی دراڑ آگئی تھی کہ ایک یونین کے جھنڈے تلے جمع ہوکر اپنائیت اور بھائی چارہ کا جو احساس ہوتا تھا اس میں کمی آگئی تھی۔ کوشش ہی اس بات کی کی گئی تھی کہ ہر آدمی ایک دوسرے سے نفرت کرے اور بیگانگی برتے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ سمجھے کہ اب کوئی ساتھی یا رفیق نہیں بلکہ اس کا حق مارنے والا ہے۔

اپادھیاجی یہ سب دیکھ کر کڑھتے تھے۔ وہ تمام ساتھیوں کے دلوں کو جوڑنا چاہتے تھے اور انہیں اس صورت حال سے لڑنے کے لئے ابھارنا چاہتے تھے۔ مگر ان کی طرح کے کشادہ دل کتنے لوگ تھے۔ سب ہی ذہن مسموم یا کم از کم متاثر ہوچکے تھے۔ وقتی طور پر سہی مگر یہی ہوا تھا۔ میٹنگ میں محض چند لوگوں کا آنا اس بات کا کھلا ثبوت تھا۔

میٹنگ میں چاہے جتنے لوگ بھی آئے ہوں، وقت تو اتنا ہی لگا تھا۔ شام گہری ہو چکی تھی اور ہر طرف غضب کا سناٹا تھا۔ سناٹا ہی نہیں ہو کا عالم تھا۔ اس عالم میں قدم باہر نکالنے میں ہول اٹھتا تھا۔ پھر بھی گھر تو جانا ہی تھا۔ وہاں بیوی اس کے انتظار میں گھل رہی ہوگی۔ پتہ نہیں کس کس اندیشے میں گھری ہو۔ بچے بھی سراسیمہ ہوں گے۔

بڑی سڑک پر آکر اس نے کچھ دیر سٹی بس کا انتظار کیا۔ مسافر ہی نہیں تھے، بس کیوں چلتی۔ بس اسٹینڈ پر کھڑے ہو کر انتظار کرنے میں اس کی جان پر بن آئی۔ دور دور تک نہ کوئی آدمی نظر آتا تھا اور نہ کوئی آدم زاد۔ یہ اس کی اندرونی کیفیت تھی یا واقعی فضا میں خوف اور دہشت کا اتنا اثر تھا کہ اس کا حلق خشک ہونے لگا۔

کچھ دیر تک بس کا انتظار کرنے کے بعد اس نے سوچا کہ اور وقت برباد کرنے سے اچھا ہے کہ آگے بڑھا جائے۔ شاید کوئی سواری مل جائے۔ حالانکہ رکشے والے تک غائب تھے۔ ان کا غائب ہونا بھی فطری تھا۔ پیٹ بھرنے اور روئی کمانے کی مجبوری میں وہ جان پر کھیل کر رکشہ چلانے نکل تو پڑتے تھے مگر بہادروں نے جب نام پوچھ پوچھ کر ان کے خون سے بھی اپنے مذہب اور دھرم کے جھنڈے اونچے کرنے شروع کر دیئے تو رکشے والے بھی گھر بیٹھ رہے۔ ٹھیک بھی تھا۔ جان بچے گی تو بہت کما لیں گے۔ ویسے ان کی رگوں میں دوڑنے والے چلو بھر خون کو بہانے والوں نے یہ سوچنے کی بالکل زحمت نہیں کی کہ کسی کا نام چاہے جو بھی ہو، یہ نام تو انہیں بچپن میں دے دیا جاتا ہے۔ کہیں پیدا ہونے یا کوئی خاص نام چننے میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔ اب سے پہلے ان میں سے کسی کا کوئی نام پوچھتا بھی نہیں تھا۔ بس رکشے والا کہہ کر بلاتا تھا اور ہر بلاوے پر وہ اس طرف لپک پڑتے تھے، مزدوری اور اجرت کے لالچ میں۔ لیکن اب تو اس کا پیدائشی نام پوچھ کر اس کے نام ہی کو نہیں اس کے وجود کو بھی ختم کرنے کی رسم چلی پڑی تھی اور اس رسم کو ختم کرنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ سرکار اور اس کے عملے بھی اس کی ضرورت نہیں سمجھ رہے تھے۔

یہی سب سوچتا ہوا وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ اسے ایک تانگہ دکھائی دیا۔ عام دنوں میں دو گھوڑے والے تانگے پر سبزی ترکاری اور مچھلیاں ڈھوئی جاتی تھیں۔ مگر آج اس تانگے پر پانچ چھ الگ قسم کے آدمی ... بڑے مسٹنڈے اور صحتمند آدمی بیٹھے چلے جا رہے تھے۔ تانگے والا بم پر بیٹھا تھا۔ دونوں نیم جاں گھوڑے ہلکان ہو رہے تھے۔ مگر پھر بھی تانگے والا چابک پر چابک برسائے جا رہا تھا۔ شاید یہ لوگ بھی جلدی میں تھے۔ تانگے والے نے مزید آمدنی کے لالچ میں اس کی طرف بھی دیکھا مگر ان اجنبی اور لٹھ باز قسم کے لوگوں کے ساتھ سفر کرنے کی اسے ہمت نہیں ہوئی۔ کیا خبر یہ مسافر

بھی تھے یا شکار کے متلاشی۔

اس لئے نظریں بچا کر اس نے اپنا سفر جاری رکھا۔ ہر چندہ تیز چل رہا تھا مگر پھر بھی اسے سردی پریشان کئے ہوئے تھی۔ موسم سے زیادہ اندر کا خوف اسے لرزہ براندام کئے ہوئے تھا۔ اس لئے اس نے اپنی رفتار میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔ ٹانگوں کے ساتھ اس کی زبان بھی چل رہی تھی اس فقرے کو دوہرانے کے لئے جسے کسی بھی آفت بلا سے بچنے کے لئے اسے بچپن ہی میں رٹایا گیا تھا مگر اس فقرے کو یاد کرنے یا دوہرانے کی حاجت شاید ہی کبھی پڑی تھی۔

جلد گھر پہنچ جانے کے خیال سے اس نے راستے میں پڑنے والی ایک کچی بستی سے گزرنے کا تہیہ کر لیا۔ بڑی سڑک چھوڑ کر ایک پیرے راستے سے وہ اس بستی کی طرف بڑھا تو اس نے دیکھا کہ ایک جگہ کچھ لوگ جمع تھے۔ وہ کون لوگ تھے... حلیہ یا لباس سے ان کی شناخت مشکل تھی۔ اصلیت تو اب صرف تیور سے ظاہر ہوتی ہے۔ اسے لگا جیسے یہ لوگ کوئی سازش کر رہے ہوں۔ اس خیال کے آتے ہی وہ ٹھٹھک گیا۔ اب تو خیر شریف محلوں میں بھی اس قسم کے واقعات ہونے لگے تھے۔ کچی بستیاں تو اس کے لئے خاص شہرت رکھتی ہیں۔

لیکن وہ جب اس راستے پر چل پڑا تھا تو پلٹنے کا سوال نہیں تھا۔ اس لئے تن بہ تقدیر آگے ہی بڑھتا گیا۔ اسے سردی کچھ زیادہ ہی محسوس ہونے لگی۔ اس لئے دونوں ہاتھ بغل میں باندھ لئے اور یہ جتاتے ہوئے کہ اسے کسی کا ڈر نہیں، وہاں جمع لوگوں کے پاس پہنچا اور ان سے آگے نکل گیا۔ مگر ان میں سے کسی منچلے یا شرپسند نے یہ کہہ کر کہ بغل میں کیا دبائے جا رہا ہے... کوئی بم وم تو نہیں، اس کی روح فنا کر دی حالاں کہ اس کی بغل میں جو چیز تھی وہ ٹفن بکس تھا جس میں وہ گھر سے دن کے لئے کھانا لایا کرتا تھا۔ مگر آج لوگ ٹفن بکس کو بھی اچنبھے اور شک سے دیکھ رہے تھے۔

جہاں تک بن پڑا وہ اس جگہ سے تیزی سے گزرا مگر اتنا تیز بھی نہیں کہ جیسے دوڑ رہا ہو۔ دوڑنے پر تو وہ اور بھی مشکوک ہو جاتا۔ اس لئے تمام حواس کو قابو میں رکھتے ہوئے بستی کی تنگ گلی اور سنکری سڑک سے گزرتے ہوئے اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ آدمیوں سے کھچا کھچ بھری بستی میں قبرستان کا سا سناٹا تھا۔ عورتیں ہولائی ہوئی اور مرد حواس باختہ تھے۔ حد تو یہ کہ چیخنے چہکنے والے بچے تک دم سادھے ہوئے تھے۔ خیر جب وہ اس بستی سے پار ہو گیا تب اسے پولس کی ایک گاڑی دکھائی دی۔ پولس کی گاڑی دیکھ کر پہلے اسے کچھ ڈھارس سی بندھی مگر پھر یہ سوچ کر کہ پولس ہی کہاں کی دوست ہے، اس کی رفتار سست ہو گئی، اچھا یہ ہوا کہ پولس والوں کی نظر اس پر نہیں پڑی اور وہ گاڑی گھما کر آگے بڑھ گئے۔ تب اسے احساس ہوا کہ کبھی اندھیرے کا ہونا بھی اچھا ہوتا ہے۔

کچی ہی سہی وہ آدمیوں کی بستی سے گزرا تھا۔ آدمیوں کی بستی سے مگر اسے ایسا لگا جیسے میلوں پھیلے ہوئے گھنے اور خوفناک جنگل سے گزرا ہو۔ اس کے اعصاب جھن جھنا رہے تھے۔ خوف اسے ایڑ لگا رہا تھا، شاید اسی لئے اس کی تیز رفتاری میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ہاں وہ ہانپ ضرور اٹھا۔

اب تو خیر وہ انگریزوں کے قبرستان تک پہنچ گیا تھا۔ یہاں سے اس کا گھر مشکل سے نصف کیلو میٹر دور تھا۔ زندگی کی مصروفیات اور مصروفیات سے زیادہ حالات کی خرابیوں نے ایسا گھیرا تھا کہ روزانہ انگریزوں کے قبرستان کے پاس سے گزرنے کے باوجود اسے یہ خبر نہیں تھی کہ وہاں کے اب کیا رنگ ڈھنگ ہیں۔ جبکہ اسکول کے زمانے میں وہ اس قبرستان سے بہت مانوس تھا۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ قبرستان کی چہار دیواری کے اندر جا کر وہ اس چودہ سالہ لڑکی کے مجسمہ کو دیکھتا تھا جو اس کے والدین نے اس کی قبر پر لگوایا تھا پھر دوسرے کتبوں کو پڑھ کر انگریزوں کے نام اور پیدائش اور موت کی تاریخیں پڑھ کر یہ حساب لگایا کرتا تھا کہ کون انگریز کتنے دنوں جیا اور زندگی میں کیا تھا۔

پھر قبرستان کے احاطے کے باہر کے پیپل کے چھتنار درختوں پر بیٹھی فاختاؤں اور ہریلوں کا شکار کرنے کی تاک میں رہتا تھا۔ قبرستان کا رکھوالا بھی ان لوگوں کے کھیل کود پر کبھی اعتراض نہیں کرتا تھا۔ وہ سب رکھوالے کے گھر والوں اور اس کے بال بچوں سے ہلے ملے تھے ہلے ملے وہ لوگ بھی تھے تب ہی تو کھیلتے کھیلتے جب تھک جاتے تھے یا پیاس محسوس کرتے تھے تو رکھوالے ہی کے یہاں پانی بھی پیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کو اس کے یہاں پانی پینے میں کوئی جھجھک نہیں ہوتی تھی۔ وہ لوگ بھی کسی سے کچھ پوچھ کر پانی نہیں پلاتے تھے۔ اس کے یہاں تو جیسے ان چہکتے ہمکتے بچوں کے لئے سبیل رہتی تھی۔

البتہ جب بہت دیر ہو جایا کرتی تھی تو اس کے یا اس کے ہم جولیوں کے بڑے بزرگ ان لوگوں کو ڈھونڈتے ہوئے وہاں آتے تھے اور پیپل والے بھوت یا انگریزوں کے مردوں سے پکڑے جانے کا خوف دلا کر بڑی مشکلوں سے ان کو گھر واپس لے جانے میں کامیاب ہوتے تھے۔ کیونکہ کبھی ان لوگوں کو کسی بھوت کا سامنا ہوا تھا اور نہ کسی انگریز مردے سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔

مگر آج انگریزوں کے اسی قبرستان کے پاس پہنچ کر اس کی سانسیں رک گئیں۔ قدم جم کر رہ گئے اور حواس نے ساتھ چھوڑ دیا۔ سائیں سائیں کی آواز سے اس کے کان بجنے لگے۔ ذرا کی ذرا رک کر اس نے اس لمبے تڑنگے ہیولے کو دیکھا جس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار تھا اور وہ اسے گھور رہا تھا۔ اسے رکا دیکھ کر ادھر سے "کون ہے وہاں" کی آواز بھی آئی تو اس نے خیریت اسی میں جانی کہ

جس طرح بھی ہو یہاں سے بھاگ کھڑا ہو۔

وہ بھاگا تو اس ہیولے نے بھی اس کا تعاقب کیا۔ صرف تعاقب ہی نہیں کیا بلکہ یہ دھمکی بھی دی کہ "رک جاؤ نہیں تو..... "گرچہ تعاقب کرنے والے کی آواز میں بھی خوف کی کپکپاہٹ تھی مگر اس کے باوجود وہ بھاگ نہیں پا رہا تھا۔ ڈراؤنا خواب دیکھتے وقت جیسے پوری کوشش کرنے پر بھی بھاگا نہیں جاتا... قدم من من بھر کے ہو جاتے۔ اس وقت اس کی بھی یہی کیفیت تھی۔ کانپتی ٹانگیں اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں اور تعاقب کرنے والے نے اسے آلیا۔ اس کا ایک ہاتھ پکڑ کر مروڑتے ہوئے اس نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

اس نے ابھی کوئی جواب بھی نہیں دیا تھا کہ وہ جابر شخص کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ "ارے تم ہو... اس طرح بھاگ کیوں رہے تھے؟... میں تو سمجھا کہ کوئی اسادی فسادی ہے۔"

اتنا سن کر اسے بھی تسلی ہوئی۔ غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ یہ تو قبرستان کے رکھوالے کا لڑکا ہے اس کا ہم عمر ہے جو اس کے بچپن کے کھیل میں بھی شریک ہوا کرتا تھا۔

دوسری مخلوق

آدھی رات نہ بھی ہوتی تو کون آجاتا۔ زیادہ سے زیادہ دور سے تماشہ دیکھنے والے کچھ لوگ جمع ہو جاتے۔ پتہ نہیں کس احتیاط کے تحت قانون نافذ کرنے والے عملے نے آدھی رات کا وقت چنااور وہ بھی دسمبر کی سرد اور سنسان رات کو۔ ایسے بے وقت دستک سن کر پربھاکر ہی دروازہ کھولنے آیا۔ سامنے قانون نافذ کرنے والے عملے کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے ٹھٹکا گیا مگر پھر بھی اپنی روایتی جرأت اور ضبط سے کام لیتے ہوئے ان لوگوں سے بے وقت آنے کا سبب پوچھا۔ قبل اس کے کہ اس کے سوال کا کوئی جواب ملتا اندر سے بیوی بچے بھی باہر نکل آئے۔ قانون نافذ کرنے والے عملے سے پربھاکر کا واسطہ پڑتا رہا تھااور ان لوگوں کی طرف سے اس کے بیوی بچوں کے لئے یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی لیکن ادھر کچھ ایسا ہوا نہیں تھا کہ قانون نافذ کرنے والے عملوں کو حرکت میں آنے کی ضرورت پڑتی اور وہ بھی جاڑے کی آدھی رات کو۔

پربھاکر کو جب وہ لوگ لے چلے تب بیوی نے کچھ کپڑے اور گرم چادر یا کمبل ساتھ کرنا چاہا مگر قانون نافذ کرنے والے عملے نے ہاتھ کے اشارے سے سختی کے ساتھ منع کر دیا۔ پربھاکر کو گاڑی میں لاکر بٹھا دیا گیا۔ اندھے شیشے والی گاڑی کے اندر اسے یا عملے کے دوسرے لوگوں کو کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا مگر باہر کی ہر چیز اندر سے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ پربھاکر کی بیوی اور بچی روہانسی کھڑی تھیں۔ چھوٹا لڑکا بھی دم بخود تھا۔ البتہ بڑا والا اٹھارہ انیس سال کا نوجوان ناپسندیدگی کا پیکر بنا کھڑا تھا جیسے اس وقت ان سے وہ یہی کہنا چاہتا ہو۔ ''پاپا آپ نے بائیس سال تک بجلی بورڈ کے انجینئر رہ کر کیا کیا۔ کچھ بھی تو نہیں۔''

گھر والے جب نظروں سے اوجھل ہو گئے تب پربھاکر نے اندھے شیشوں والی گاڑی کے اندر کا جائزہ لیا۔ اس کے داہنے پہلو میں قانون نافذ کرنے والے عملے کی وہ شہرہ آفاق خاتون بیٹھی تھی جسے زیادہ ٹیڑھے لوگوں یعنی انٹلجنیشیا کو راہ راست پر لانے اور انہیں ان کی مردانہ خوبیوں کو زائل کرنے کے لئے مامور کیا جاتا تھااور وہ بے چاری غیر فطری منصبی فرائض ادا کرتے کرتے اپنی نسوانی کشش سے محروم ہو گئی تھی۔ مردانہ وردی پہننے والی یہ زنانہ افسران دو میں سے کچھ بھی نہیں لگتی تھی۔ اس نے عملے کے دوسرے افراد کی طرف، جن کی تعداد تین تھی، دیکھا تو وہ سب وردی

پیٹی اور ہتھیاروں سے لیس تھے۔ مگر جانے کیوں ان کے چہروں پر وہ حیوانیت ہویدا نہیں تھی جو ان کی پہچان ہوتی ہے۔ خلاف معمول ان کے چہرے پر اوڑھی گئی نرمی اور ملائمیت کے آثار دیکھ کر پربھاکر کو حیرت ہوئی مگر اسے ایک چال سمجھ کر وہ اس ملائم جال میں نہیں آیا بلکہ اپنے حوصلے کو باقی رکھے بیٹھا رہا۔

البتہ اس وقت وہ چونک پڑا جب ایک دھچکے کے ساتھ گاڑی رکی اور اندھے شیشوں کے اس پار سے ایک سنتری بندوق تانے نظر آیا جو چنگھاڑ کر کچھ پوچھ رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر وہ سامنے والی سیٹ کی پشت کے نیچے چھپ گیا۔ ڈر سے نہیں بلکہ بلاوجہ جان کی بازی لگانے یا جان گنوا دینے کو وہ بہادری نہیں سمجھتا تھا۔ گاڑی کے اندر بیٹھے عملے کے افراد نے جب۔ ''دوست، دوست۔'' کی رٹ لگائی تب سنتری نے بندوق سیدھی کی اور گاڑی احاطے میں داخل ہو کر پورٹیکو میں جا کر رکی۔

اندھے شیشیوں والی گاڑی سے باہر آکر قانون نافذ کرنے والے عملے پربھاکر کو اسکورٹ کر کے ایک خوبصورت اور شاندار عمارت میں لے چلے جو روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ اس کے فرش دبیز غالیچوں سے ڈھکے تھے اور اطراف میں پھیلی زمین کے بیچوں بیچ یہ عمارت اسی طرح لگ رہی تھی جیسے شفیق گود میں بیٹھی ہوئی ہو۔ اندر پہنچ کر عملے کے یک فرد نے کہا۔

''یہ رہا آپ کا سٹنگ روم۔''

سٹنگ روم سبز مخمل میں منڈھے ہوئے منقش فرنیچر سے آراستہ تھا۔ ایک تپائی پر پش بٹن والا ایک ٹیلی فون اور ایک انٹر کام رکھا ہوا تھا۔

کچھ اور آگے لے جا کر سلیپنگ روم، باتھ روم اور ڈائننگ ہال وغیرہ کا معائنہ کرایا گیا۔ پربھاکر پر اس شان و شوکت کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ آدمی کو کمزور کرنے والے آرائشی سامانوں نے کبھی اسے نہیں بھرمایا تھا۔ باوجود یہ کہ وہ بائیس سال تک سینئر انجینئر رہا تھا مگر اس کے گھر میں جہیز میں ملے فرنیچر کے علاوہ اس قسم کا فروعی سامان اگر کچھ تھا تو وہ ایک فرج جو اس نے بیوی کے بار بار کہنے پر اس کی آسانیوں کی خاطر قسطوں پر خریدا تھا، یا وہ پرانی وضع کا ایک ٹیلی فون جو لازمی سروس میں ہونے کے ناتے اس کے گھر میں لگا تھا اور اس کی وجہ سے اسے پبلک سروس میں بھی مدد ملتی تھی۔

قانون نافذ کرنے والے عملے یہ کہہ کر کہ جس چیز کی ضرورت ہو آپ حکم دے دیجیے، ٹیلی فون اور انٹر کام کی طرف اشارہ کیا اور باہر چلے گئے۔

پربھاکر نے گھوم گھوم کر ہر چیز کا جائزہ لیا۔ صوفے کو ہاتھ لگایا تو اسے وہ کارٹون یاد آگیا

جس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ صوفے کے ایک سرے پر کوئی دبلا پتلا آدمی بیٹھا تھا۔ کوئی موٹا سا آدمی اس صوفے کی دوسری طرف دھب سے بیٹھا تو تنی ہوئی اسپرنگ کی بدولت وہ دبلا پتلا آدمی اوپر اچھل گیا۔ کارٹون کو یاد کر کے اسے ہنسی آئی اور آزمانے کی خاطر خود صوفے پر بیٹھا تو اسے حیرت ہوئی کہ ایک یہ صوفہ ہے اور ایک اس کے گھر کا نام نہاد صوفہ جس پر بیٹھ کر اٹھو تو گھنٹوں گدی دبی رہتی ہے۔ ایسے ہی موقع پر پربھاکر کا بڑا لڑکا یہ شوشہ چھوڑتا تھا کہ پاپا آپ بائیس سال سے الیکٹریسٹی بورڈ کے انجینئر ہیں۔ سینئر انجینئر۔ آپ سے جو جونیئر ہیں ان کے گھروں میں کیا نہیں ہے اب فرنیچر بدلئے اور ایک کلر ٹی وی دلا دیجئے۔

تب چھوٹی لڑکی بھی پربھاکر کی گود میں بیٹھ کر اس کے منہ پر اپنے ننھے ننھے ہاتھ پھیرنے لگتی اور دوسرا لڑکا اس کی کرسی کی پشت پکڑ کر کھڑا ہو جاتا اور بیوی اسے پر امید نگاہوں سے تکنے لگتی۔

کچھ دیر تک تو پربھاکر یہ دلیل دیتا رہتا کہ اوروں کے یہاں کیا ہے، یہ مت دیکھو، کس طرح آیا ہے یہ دیکھو۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ بجلی کی چوری کرنے والے بڑے کسانوں اور صنعت کاروں کے جرم میں شریک ہو جاؤں۔

لڑکا جواب دیتا۔ ”لیکن آپ کے الگ تھلگ رہنے سے بجلی کی چوری رکی تو نہیں ہے۔ خوب چوری ہو رہی ہے اور آپ کے جونیئروں کو اس کا معاوضہ مل رہا ہے۔ کیا پتہ آپ کا حصہ بھی وہی ہضم کر جاتے ہوں۔“

یہ باتیں بے شک لاجواب کرنے والی تھیں مگر پربھاکر کو لگتا تھا کہ دوسروں کو تو چھوڑو خود اس کی فیملی کے ممبر اس کے آدرشوں کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ان آدرشوں کا جنہیں اس نے طالب علمی کے دور سے سینے سے لگا رکھا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ بپھر اٹھتا تھا۔ ظاہر ہے اسے اپنے آدرش کی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔ سختیاں اور سزائیں جھیلنی پڑتی تھیں مگر اس کے پائے استقامت میں کبھی لغزش نہیں آئی۔

صوفے سے اٹھ کر وہ چہل قدمی کرنے لگا۔ پورے مکان کا چکر کاٹنے پر اسے پتہ چلا کہ کم از کم چار بیڈ روم اور ہال پر مشتمل ایک نہایت آراستہ و پیراستہ مکان ہے۔ اس نے اس کمرے میں بھی جھانکا جسے اس کا بیڈ روم بتایا گیا تھا۔ قیمتی قالین پر دھرے ڈبل بیڈ پر ویسا ہی اچھلنے والا گدا۔ کھڑکیوں پر دبیز ریشمی پردے۔ پردوں کو اس نے جھٹکا تو سامنے کھلا میدان اور میدان سے باہر احاطے کی باڑ اور اس سارے میں چھٹکی ہوئی چاندنی نے اسے کچھ دیر کے لئے دم بخود کر دیا۔

اس کیفیت سے نکلنے کے بعد اس نے گھڑی دیکھی۔ تین بج چکے تھے۔ کئی دن سے اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی اس لئے سونے کی خواہش جاگی مگر سوئے تو کہاں۔ اس گدے دار بستر پر تو وہ سونے سے رہا۔ وہ فرش پر چٹائی یا دری ڈال کر سونے کا عادی تھا۔ اس کی بیوی کہہ کہہ کر تھک گئی تھی مگر وہ بیڈ پر نہیں سویا آج اس بیڈ پر بھلا کیوں سوئے گا۔ بیڈ کور کھینچ کر اس نے غالیچے پر بچھایا اور ایک کمبل لے کر لیٹا اور لیٹتے ہی گہری نیند میں ڈوب گیا۔

لمبی اور گہری نیند لے کر وہ دن چڑھے اٹھا تو اس کی طبیعت بڑی ہشاش بشاش تھی۔ جاگنے پر ایک لمحے کے لیے چکرایا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر اسے یاد آیا کہ قانون نافذ کرنے والے عملے اسے رات کے وقت یہاں لائے تھے اور یہ بتائے بغیر کہ ایسا کیوں کیا گیا تھا اسے وہاں چھوڑ گئے تھے۔ اب اس نے سوچنا شروع کیا۔ وہ جس یونین کا کرتا دھرتا تھا وہ یونین صنعت کاری اور پیداواری عمل میں رخنے ڈالنے کے حق میں نہیں تھی۔ البتہ مزدوروں کے حقوق کے لئے ضرور لڑتی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ عوامی فائدے کا نام لے لے کر سرکاری خرچ پر جو پروجیکٹ بنتے ہیں، بجلی گھر لگائے یا ڈیم باندھے جاتے ہیں اس سے عوام کو کم اور سرمایہ داروں کو زیادہ فائدے پہونچتے ہیں تاہم کچھ بے کار لوگوں کو روزگار ملتا ہے اور قومی دولت میں بھی اضافہ ہونے کی آس ہوتی ہے اس لئے وہ جھگڑے کے بجائے مصالحانہ طریقے سے مزدوروں کے حق کے لئے لڑتے تھے تاکہ مزدوروں کو خیرات نہیں حق محنت ملے اور سرکاری املاک کی بھی لوٹ نہ ہو اور اسی لئے پربھاکر کی یونین زیادہ مقبول اور مضبوط تھی مگر پیسے والوں کا کھیل ہی نرالا ہوتا ہے۔ وہ لوگ پربھاکر اور اس کے ساتھیوں کے طرز فکر سے خوش ہونے کے بجائے انہیں کمزور کرنے کے خیال سے مزدوروں میں پھوٹ ڈالنے کی ایک سے ایک چالیں چلنے لگے۔ صنعتی لحاظ سے تیزی کے ساتھ ترقی کرنے والے اس پسماندہ علاقے میں کئی کارخانے تھے جن میں مختلف علاقوں اور ذات پات کے مزدور کام کیا کرتے تھے۔ جانے کہاں سے کچھ شہدے اس خطے میں آگئے جنہوں نے پہلے معمولی معمولی باتوں پر جھگڑے کرائے، خون خرابہ کیا اور پھر اپنی علاحدہ یونین بنانے لگے۔ جذبات کی رو میں بہہ کر مزدور بھی ان کی طرف جانے لگے اور اپنی یونین کو سرکاری منظوری دلانے کے لیے کارخانوں کے مالکوں اور منتظموں پر بھی دباؤ ڈالنے لگے۔ گھیراؤ کے علاوہ قاتلانہ حملوں کی وارداتیں بھی ہوئیں۔ پربھاکر کے نقطۂ نظر سے یہ سب کچھ نہایت نامناسب تھا۔ مگر قانون نافذ کرنے والے عملوں کے کان پر جوں رینگ رہی تھی اور نہ ہی حکومت کوئی مستعدی دکھا رہی تھی۔

یہ سالے حرکت میں آئے بھی تو پربھاکر کو پکڑنے کے لیے۔

پر بھاکر انگڑائی لیتا ہوا اٹھا اور باتھ روم کی طرف بڑھا۔ اتنا بڑا باتھ روم کہ بیڈ روم مات۔ ہر طرح کے گیجٹ اور فکسچر سے آراستہ۔ اس نے فراغت حاصل کرنے کے بعد دیکھا کہ واش بیسن کے پاس بالکل نیا ٹوتھ برش، پیسٹ اور شیونگ کا سامان بھی رکھا ہے۔ برش کو تو ہاتھ نہیں لگایا البتہ انگلی پر پیسٹ لیتے ہوئے اسے اپنے گھر کا منجن یا مڑا تڑا ہوا پیسٹ ٹیوب یاد آیا۔ ہاتھ منہ دھو کر اس نے شیو کیا۔ واش بیسن کی ایک ٹونٹی سے ٹھنڈا پانی آرہا تھا اور دوسری ٹونٹی سے گرم۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو گیزر بھی لگا تھا۔ گویا وہ گرم پانی سے غسل کر سکتا تھا۔ ورنہ دسمبر اور جنوری کے سرد مہینوں میں اس کے نہانے کے لیے بیوی چولہے پر ایک پتیلی پانی گرم کر دیا کرتی تھی جس سے ایک بالٹی پانی کی ٹھنڈ کم ہو جاتی تھی۔ مگر گیزر سے نکلنے والے گرم پانی میں وہ دیر تک نہاتا رہا۔ نہا دھو کر وہیں قریب ہی ٹنگے ہوئے نرم و گداز تاویل کو لپیٹے جب باہر نکلا تو طبیعت اور بھی ہلکی ہو چکی تھی۔ بیڈ روم میں کرتا اور پاجامہ پہلے ہی سے موجود تھا۔ گھر سے اسے کپڑے لینے کا موقع نہیں دیا گیا تھا اس لیے اس نے وہاں رکھے ہوئے کپڑوں کو ہی پہن لیا اور پھر باہر آیا۔

ڈرائنگ روم میں کئی اخبار رکھے ہوئے تھے۔ اخبار میں ہوتا ہی کیا ہے جھوٹ کے علاوہ۔ یہ سوچتا ہوا باہر برآمدے میں آیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ صاف و شفاف برآمدہ سنسان تھا۔ چند قدم چل کر وہ میدان میں اترنے والی سیڑھیوں تک آیا۔ میدان میں اُگی گھاس کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ کسی نے سبزے کا قالین بچھا دیا ہو۔ سبزے کے قالین کے آخری سرے پر جو گیٹ تھا وہاں دو بندوق دھاری سپاہی نڈھال سے بیٹھے تھے۔

وہاں سے پر بھاکر کی نظر ہٹی تو اس نے دیکھا کہ ایک طاقتور مگر ڈرا سہما سا نوجوان حکم کے بندے کی طرح اس کے پاس کھڑا ہے۔ اس نے پوچھا۔

''چائے لے آؤں صاحب؟''

''ہاں، لے آؤ۔''

کھانے کی میز پر صرف چائے نہیں آئی تھی بلکہ بٹر، ٹوسٹ اور ہاف فرائی انڈہ بھی تھا۔ پر بھاکر کو ناشتہ میں بڑا مزہ ملا اور ناشتہ سے زیادہ چائے اچھی لگی۔ خوبصورت ٹی کوزی سے ڈھکی نازک سی چائے دانی سے اس نے پیالی میں چائے انڈیلی۔ اس کے باہر ہی سے چائے ہلتی ہوئی نظر آتی تھی۔ اسٹین لیس اسٹیل کے اس مگے میں یہ بات کہاں جو اس کے گھر میں تھا، جہاں چائے، شکر، دودھ ایک ساتھ ابال کر چائے بنائی جاتی ہے۔ اس نے الگ الگ برتن سے شکر اور دودھ چائے کی پیالی میں حسب منشا ڈال کر ہلایا اور پھر گھونٹ بھرنے لگا۔

اسی طرح اس نے ایک اور پیالی تیار کی اور کپ اٹھائے ہوئے صوفے پر آبیٹھا۔ وہاں تپائی پر پیالی رکھ کر اس نے اخبارات اٹھالیے۔ کسی بھی اخبار میں کچھ بھی نہیں تھا بکواس کے علاوہ۔ البتہ ایک خبر کو اس نے توجہ سے پڑھا۔ یہ اسمبلی کی خبر تھی۔ نیتاؤں نے صنعتی بے چینی پر تشویش کا اظہار کیا تھا۔ جھوٹے، مکار لوگوں کی شورش کو ہر اخبار نے نمایاں طریقے سے چھاپا تھا۔ اس نے ہر اخبار کا ورق ورق پلٹ کر دیکھا تھا۔ کسی میں اس کے گرفتار کیے جانے کی کوئی خبر نہیں تھی۔ پولس کے بتائے بغیر اخبار والوں کو بھی کہاں پتہ چلتا ہے کہ شہر میں کیا ہوا اور کیا نہیں۔ کورٹ میں پیشی سے پہلے شاید اس کی گرفتاری کی خبر بھی نہ چھپے۔ اسے اتنے پر اسرار طریقے سے پکڑا گیا تھا کہ نہ کسی کو اس کی گرفتاری کی خبر ہو سکتی تھی اور نہ اسے کسی دوسرے کی گرفتاری کی۔

پربھاکر کا دل چاہا کہ اپنے دفتر میں، یونین آفس میں اور گھر پر فون کر کے حال احوال معلوم کرے۔ سامنے پڑے فون پر ٹرائی کر کے دیکھا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ تب پھر صوفے پر آبیٹھا اور اخبار کی ورق گردانی کرنے لگا۔

اتنے میں باہر کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ پھر کھٹ کھٹ کرتی قانون نافذ کرنے والے عملے کی شہرہ آفاق خاتون آفیسر اندر آئی جو اپنی نسوانی کشش سے محروم ہو چکی تھی۔ پربھاکر اسی طرح بیٹھا رہا۔ اس نے سمجھا شاید اسے کورٹ لے جانے کے لیے آئی ہے۔ خاتون آفیسر نے اسے ہیلو کہا اور نہیں چاہتے ہوئے بھی اس نے سر ہلا کر جواب دیا۔ خاتون آفیسر سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ باوجود یہ کہ اس کی نسوانی کشش زائل ہو چکی تھی مگر پھر بھی وہ ''بیوٹی ایڈ'' استعمال کرنا نہیں بھولی تھی۔ از راہ اخلاق پربھاکر نے اس سے پوچھا۔

''چائے لیں گی۔''

''چلے گی۔''

پربھاکر چائے بنانے کے لیے اٹھنے لگا تو اس نے روکا۔

''ارے آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں؟'' پھر اس نے کھنکتے ہوئے لہجے میں آواز دی۔ ''بوائے۔''

جواب میں وہی طاقتور نوجوان آیا جس نے پربھاکر کا ناشتہ لگایا تھا۔ اب وہ صرف دھاری دار بنیان اور پاجامے میں نہیں تھا بلکہ جسم پر سفید قمیص اور سر پر گاندھی ٹوپی بھی لگائے ہوئے تھا۔ اس نے خاتون افسر کے حکم کی تعمیل کی۔

خاتون افسر کچھ دیر بیٹھی اس سے خوش گپیاں کرتی رہی اور یہ کہا کہ تکلف سے کام نہ

لیجئے گا۔ جس چیز کی ضرورت ہو منگوالیا کیجئے۔ اس قسم کی معمولی باتیں کرنے کے بعد اچانک وہ اٹھی اور 'بائی' کہہ کر واپس ہونے لگی۔ پربھاکر نے اسے حیرت سے دیکھا اور سوچنے لگا کہ کیا کوئی اور افسر اسے کورٹ لے جانے کے لیے آئے گا مگر خاتون افسر سے اس نے کچھ نہیں پوچھا۔ وہ اپنی ''ہیوج ہپ'' کو دائیں بائیں ہلاتی چلی گئی۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد وہی طاقتور بوائے نمودار ہوا اور پوچھنے لگا۔ ''کھانا لگاؤں صاحب؟''

پربھاکر جو صرف ایک وقت کھانے کا عادی تھا اسے گھورنے لگا کہ ابھی تو ڈٹ کر ناشتہ کیا ہے لیکن یہ سوچ کر کہ کس وقت قانون نافذ کرنے والا عملہ اسے کورٹ میں لے جانے کے لئے آجائے اور کورٹ کا حال معلوم ہے کہ کام پانچ منٹ کا ہو تو بھی سارا دن بیت جائے۔ اس نے خواہش نہ ہونے پر بھی ہاں کہہ دیا۔ ''لگاؤ''۔

میز پر سسرالی کھانا لگا تھا۔ کئی سبزیوں کے علاوہ مٹن بھی گھی پڑی دال اور نہایت باریک چاول۔ اس کے یہاں دال کے علاوہ ایک ہی سبزی بنتی تھی۔ سنڈے ونڈے کو مٹن آجاتا تھا تو وہ بھی نپا تلا اور یہاں اتنی افراط۔ کھانے سے نپٹ کر وہ صوفے پر آبیٹھا۔ پھر صوفے پر دراز ہو کر اخبار الٹنے پلٹنے لگا۔ کھانے اور مرغن کھانے کا اپنا نشہ ہوتا ہے۔ پربھاکر کی آنکھ لگ گئی۔

نہایت میٹھی آواز میں گایا جانے والا گیت سن کر پربھاکر اٹھا تو دن ڈھل چکا تھا۔ ریڈیو سے دھن ابھر رہی تھی۔ وہ کمرے سے باہر آیا تو ورانڈے پر وہ ''بوائے'' بیٹھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ گیٹ پر دو بندوق دھاری سپاہی بھی تھے۔ وہ چلتا ہوا لان میں آگیا۔ میدان کے آدھے حصے میں عمارت کا سایہ اور آدھے حصے میں پیلی اور نرم دھوپ تھی۔ وہ دھوپ میں جا کر کھڑا ہوا۔ یہ عمارت کسی غیر آباد علاقے میں تھی۔ کوئی آبادی نظر نہیں آرہی تھی اور نہ کوئی راہ گیر۔ پھر بھی وہ کچھ دیر تک باہر دیکھا کیا۔ باہر سے اس کا خیال اور نظر لان میں لوٹی تو وہاں بید کی آرام کرسیاں اور شیشہ جڑی تپائی رکھی تھی اور وہیں بوائے کھڑا تھا۔ اس کی توجہ اپنی جانب مبذول پا کر اس نے پوچھا'' چائے لے آؤں صاحب؟''۔

پربھاکر ایک کرسی پر بیٹھا خوشبودار چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے سوچنے لگا کہ آخر اسے کورٹ میں کیوں نہیں پیش کیا گیا۔ ہو سکتا ہے کل لے جائیں۔ لیکن اسے پکڑا ہی کیوں گیا؟ اس کی یونین کے کسی بھی آدمی نے ایسا کوئی خلاف قانون کام نہیں کیا ہے کہ شبہ یا شہ دینے کے الزام میں اسے پکڑنے کی ضرورت ہو۔

پربھاکر اسی سوچ میں گم تھا کہ گیٹ پر، لان کے گرداگرد اور اس خوبصورت عمارت کے

اندر بتیاں جل اٹھیں۔ روشنی میں وہ خوبصورت عمارت جگمگا اٹھی۔ اتنا خوبصورت مکان کس کا ہے اور خالی کیوں ہے۔ وہ خود جہاں رہتا ہے اس کی سیڑھیاں اندھیری جالیاں ٹوٹی پھوٹی تھیں اور عمارت کائی میں لپٹی تھی۔ لوگ اور ان کے ان گنت بچے اودھم مچاتے رہتے تھے۔ اس کے برخلاف یہاں کس قدر سکون اور اطمینان ہے۔

بوائے نے آکر پربھاکر کے خیالات کا تانا بانا الجھا دیا۔ اس بار وہ اونی شال لیکر آیا تھا۔ پربھاکر نے شال لے لیا اور کرسی سے اٹھ کر اندر جانے لگا۔ وہاں بھی بوائے حاضر ہوا اور دیوار میں لگے شوکیس کے ایک حصے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''ریڈیو لگاؤں صاحب؟''

پربھاکر کو خبروں سے تو دلچسپی تھی مگر اپنے ہاں کے ریڈیو کی خبروں سے نہیں۔ گھر پر رات کے کھانے کے بعد پابندی سے وہ 'بی بی سی' سنا کرتا تھا مگر بی بی سی کی خبروں پر بھی اسے اندھا اعتماد نہیں تھا۔ اس کے ذہن کی ساخت ایسی ہو چکی تھی کہ خبریں الیکٹرانک میڈیا دے یا پرنٹ میڈیا، سو فیصد صحیح نہیں ہوتیں۔ البتہ بین السطور میں چھپی حقیقت کو پربھاکر پڑھ لیا کرتا تھا۔

وہ جگمگاتی روشنی میں صوفے پر بیٹھا کیا سے کیا سوچتا رہا۔ ساڑھے آٹھ بجتے ہی بوائے نے رات کے کھانے کے لئے پوچھا تو پربھاکر اس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا۔ اس نے جو کھایا تھا وہی ابھی ہضم نہیں ہوا تھا کہ یہ پھر کھانے کی رٹ لگانے لگا۔ شاید یہ آخری آئٹم بھگتا کر وہ گھر جانا چاہتا ہو۔

''تمہیں جانا ہے تو جا سکتے ہو۔ کھانا میز پر لگا دو میں کھا لوں گا۔''

''نہیں صاحب۔ مجھے کہیں جانا نہیں ہے، میں تو یہیں رہتا ہوں۔''

''اچھا! اچھا! مگر ابھی تو بھوک نہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں صاب۔''

نہ کوئی کام تھا اور نہ کوئی خاص خیال۔ بے شغلی میں پربھاکر نے سوچا کہ کھانا ہی کھا لیا جائے تاکہ یہ لڑکا سوئے پڑے۔

''بوائے؟''

''ہاؤ صاحب۔''

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"ماروتی۔"

"ماروتی۔ لگاؤ کھانا۔"

کھانے میں پراٹھا اور چکن تھا۔ دوسری چیزیں الگ تھیں۔ پربھاکر نے سوچا ایک آدھ دن کی مہمان داری ہے کھاؤڈٹ کے۔ جیل میں یہ مینو کہاں۔ ویسے بھی وہ ان شن وغیرہ پر اعتقاد نہیں رکھتا تھا لیکن ایک بات تھی جس سے اس کا کھانا بے مزہ ہو گیا۔ یہاں وہ اکیلا مٹن چکن اڑا رہا ہے اور وہاں اس کے بیوی بچے... تیج تہوار میں کبھی مرغی مل جاتی تھی مگر...

آج وہ پھر کل کی طرح غالیچے پر ہی لیٹا۔ اتنا سوچ چکا تھا کہ نیند کے آنے کی امید نہیں تھی مگر برسوں بعد شکم سیر ہو کر مرغن کھانا کھانے کے طفیل پربھاکر جلدی ہی سو گیا... گہری نیند۔

دوسری صبح بھی پربھاکر کو وہی سب کچھ کرنا پڑا تھا جو ایک دن پہلے کر چکا تھا۔ ان سب سے نپٹ کر وہ اخبار لے کر بیٹھا۔ آج کے اخبار میں صنعتی بے چینی کے متعلق اسمبلی میں ہونے والی گرما گرم بحث اور سرکار کی طرف سے ظاہر کی گئی گہری تشویش درج تھی۔ تشویش خاص طور پر اس وجہ سے بھی ظاہر کی گئی تھی کہ اب یونینوں کی طرف سے قانون ہاتھ میں لینے کی وارداتیں ہونے لگی تھیں۔ یہ واردات کہاں ہوئی تھی اس کے متعلق نہ تو سرکار کے بیان سے کچھ ظاہر ہوتا تھا اور نہ انویسٹی گیٹیو جرنلزم نے کوئی روشنی ڈالی تھی۔

پربھاکر کو اتنا معلوم تھا کہ مزدوروں کے اتحاد کو توڑ کر شہدوں نے ٹریڈ یونین میں جو دخل دینا شروع کیا تھا اس کو پہلے تو انتظامیہ ہی کی تائید ملی اور اب کچھ مزدور بھی لڑاکا ٹریڈ یونین کے جھنڈے تلے جمع ہونا شروع ہونے لگے تھے۔ یہ لوگ عارضی فائدہ کے لئے دوررس نقصان کا ماحول پیدا کر رہے تھے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ان لوگوں نے کیا کیا تھا یہ جاننے کے لئے پربھاکر کو تجسس تھا مگر معلومات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ بلاوجہ اسے اس شاہی خلوت میں لا کر رکھ دیا گیا تھا جہاں سے رابطہ پیدا کرنے کا کوئی وسیلہ نہیں تھا۔ ایک فون بھی تھا تو بے کار اور ناکارہ۔

غرض یہ کہ پربھاکر اسی شش و پنج میں تھا کہ بلا سان و گمان قانون نافذ کرنے والی خاتون آفیسر آدھمکی۔ وہ وردی پیٹی میں نہیں بلکہ عام زنانہ لباس میں تھی۔ بیوٹی ایڈ کا سہارا لئے ہوئے۔ اس کی سج دھج کو دیکھ کر پربھاکر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی جسے خاتون آفیسر نے بھی

محسوس کیا اور سامنے کے صوفے پر ایک ادا سے بیٹھ گئی۔ آج نہ وہ عجلت میں تھی اور نہ تکلف کے خول میں۔

اخبارات سے بات چلی تو سیاسیات، اقتصادیات اور معاشیات کے نکتے کھنگالے جانے لگے۔ باوجودیکہ وہ سرکار کی محض ایک پرزہ تھی مگر اس کی علمیت سے پربھاکر خاصہ متاثر ہوا۔ لیکن حالات کو دیکھنے اور سمجھنے میں دونوں کے نقطۂ نظر میں فرق تھا جسے دیکھتے ہوئے پربھاکر نے یہ محسوس کیا کہ کیسے کیسے ذہین اور باخبر لوگوں کو ایسے سانچے میں ڈھال لیا جاتا ہے کہ ان کے ذہن کے سارے دریچے بند ہو جاتے ہیں۔

قانون نافذ کرنے والی خاتون افسر کو اپنا ہم خیال بنانے کی فضول کوشش کرنے کے بجائے پربھاکر نے اس سے یہ اگلوانا چاہا کہ آخر کیا ہوا ہے جو سرکار اس قدر تشویش زدہ ہے۔ مگر اس حرافہ عورت نے کوئی ٹھوس خبر نہیں دی۔ شاید وہ بھی پربھاکر کی سوچ کا دھارا بدلنا چاہتی تھی۔ اس میں کامیابی نہیں ملی تب ٹریڈ یونین والوں پر لعن طعن کرنے لگی۔ کوئی بات بنتے نہیں دیکھ کر پربھاکر نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ خاتون افسر بھی چپ رہی۔ خاموشی جب گراں گزرنے لگی تو پربھاکر نے ماحول کے بوجھل پن کو دور کرنے کے لئے پوچھا۔

''چائے منگوائی جائے؟''

''نہیں۔ اب میں جاؤں گی۔''

''کیوں۔ اس کیزول ڈریس میں دیکھ کر میں تو سمجھ رہا تھا کہ آج آپ چھٹی کر رہی ہیں؟''

''نہیں۔ بس یونہی۔''

اتنا کہہ کر خاتون آفیسر پھیکی مسکراہٹ بکھیرتی چلی گئی۔

پربھاکر کو اس کے آنے کی خوشی ہوئی تھی اور نہ جانے کا غم۔ البتہ ٹریڈ یونین فرنٹ پر ہونے والی واردات کے متعلق وہ جو کلیو دے گئی تھی اس سے اس کا تردد بڑھ گیا تھا مگر اس کے ازالے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ وہ بار بار ریڈیو کے کان مروڑتا رہا مگر وہاں سے بھی صرف سگم سنگیت سنایا جاتا تھا۔ شام کے بلیٹن میں اتنا بتایا گیا کہ ایلورا الیکٹرون کے ۴۱ سالہ ڈپٹی جنرل منیجر کا گھیراؤ کیا گیا اور ان کے دفتر میں توڑ پھوڑ مچائی گئی۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں بتایا گیا۔ ایلورا میں چونکہ یونین پربھاکر ہی کی تھی اور وہاں قبضہ کرنے کے لئے شہدوں کی منڈلی زور آزمائی کر رہی تھی اس لئے اسے کچھ

زیادہ ہی فکر ہوئی۔ پریشانی میں وہ لگا تار ٹہلتا رہا۔ آج اس نے لان کی طرف بھی رخ نہیں کیا۔ ماروتی نے چائے لا کر دی تو اسے بھی پینے کا ہوش نہیں رہا۔ وہ بی بی سی سننے کے لئے بے چین تھا لیکن اس کی بے چینی دیکھ کر بی بی سی والے وقت سے پہلے تو خبر نشر کرتے نہیں۔ خبریں نشر کرنے کا وقت آیا تو اس نے کان لگا دیا۔ معلوم ہوا کہ ایلورا الیکٹرون میں صرف توڑ پھوڑ اور ٹکراؤ کی واردات نہیں ہوئی بلکہ ڈپٹی جنرل منیجر بھوپندر کمار پر خنجر اور سلاخوں سے حملہ بھی کیا گیا اور ان کی حالت بہت نازک ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے ریاستی حکومت نے دہشت اور انتشار کو روکنے والا قانون 'ٹاڈا' (T.A.D.A) نافذ کر دیا ہے۔ یہ سن کر پربھاکر سکتے میں آ گیا۔ پہلے تو اس کو بھوپندر کے شدید طور پر گھائل ہونے کا دکھ ہوا۔ وہ پربھاکر سے تین چار سال چھوٹا مگر بڑا سمجھدار، شریف اور دوستانہ طبیعت کا آدمی تھا۔ دوسرے یہ یقیناً شہدوں کی حرکت ہوگی جنہیں حکومت اور سیٹھوں نے پہلے دودھ پلایا اور اب ٹاڈا لگایا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب ہوا چھ مہینے کوئی پوچھ گچھ نہیں۔ نہ داد نہ فریاد۔ دو دن تک اسے کورٹ میں اسی وجہ سے پیش نہیں کیا گیا کہ ٹاڈا لگانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ اسے حوالات میں بھیجنے کے بجائے اس شاہی قلعے میں لانے کی بھی یہی وجہ تھی۔

جو بھی ہو۔ حقیقت معلوم ہو جانے پر پربھاکر تفکرات کے جال میں گھر گیا۔ اسے اپنے پکڑے جانے کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی اور ساتھیوں کے متعلق جاننے کی۔ دوسرے ساتھی باہر رہیں گے تو یونین کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور شہدوں کو ان کی اوقات معلوم ہو جائے گی۔ لیکن جب اس کی توجہ گھر کی طرف جاتی تھی تو وہ بوکھلا اٹھتا تھا۔ پتہ نہیں اس کے بیوی بچے کس حال میں ہوں گے۔ اگرچہ وہ پہلی بار گرفتار نہیں ہوا ہے لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ ایک دو بچے تھے تو اس کی بیوی سب جھیل جاتی تھی۔ یا پھر اپنے میکے چلی جاتی تھی مگر اب نہ میکے میں وہ بات رہی تھی اور نہ ہی گھر کے مسائل آسان۔ دوسرے مہینے کا آخری ہفتہ تھا۔ کسی نہ کسی سے قرض لے کر ہی یہ ہفتہ گزرتا تھا۔ اس کا انتظام بھی اسے ہی کرنا پڑتا تھا۔ اس کی بیوی بے چاری کیا کرے گی۔ مان لیا جائے کہ یہ ہفتہ نکال بھی لے گی تو اگلے مہینے کا کیا ہوگا۔ اسے تنخواہ ملے گی یا نہیں اور اگر ملے گی تو اس کے گھر کس طرح پہنچے گی۔ صاحب لوگوں سے تو اس کی امید نہیں۔ اس کا کون دوست ہے... نہیں ہے ..اس کی بھی تو خبر نہیں ہے۔

آدھی سے زیادہ رات اسی وسوسے میں گزر گئی۔ کھانے تک کا ہوش نہیں رہا۔ تھک گیا تو صوفے پر بیٹھ رہا۔ پھر سونے کی کوشش کرتا ہوا ایک بیڈ پر لیٹ گیا۔ خدا معلوم اس بیڈ میں کیا جادو تھا کہ اس قدر پریشان ہونے پر بھی صبح ہوتے ہوتے پربھاکر کو نیند آ گئی۔

دوسری صبح کچھ دیر سے آنکھ کھلی۔ اس نے صبح کے فرائض ادا کئے اور پھر نئے دھلے ہوئے کپڑے بدل کر باہر آیا۔ کھٹ پٹ کی آواز سن کر ماروتی اندر آیا۔ رات کا کھانا اسی طرح پڑا رہ گیا تھا جسے اس نے ہٹا دیا تھا۔ اور اب گھبرایا گھبرایا سا پربھاکر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حالاں کہ پربھاکر کا ان دو دنوں میں ایسا رویہ نہیں تھا کہ کوئی ماتحت گھبرائے یا ڈرے۔ لیکن شاید ماروتی اسے فکر مند دیکھ کر پریشان تھا۔ اس نے ہمت کر کے پوچھا۔

''بریک فاسٹ صاب۔''

ایک وقت کے ناغہ اور نہانے دھونے کے بعد پربھاکر کو خوب کھل کر بھوک لگی تھی۔ اس نے سر ہلا کر ہاں کہا۔

پربھاکر نے آج بھی خوب ڈٹ کر ناشتہ کیا اور چائے پی۔ پھر اخبار اٹھا لیا تو اس کی گرفتاری کی تو کوئی خبر نہیں تھی، البتہ ٹاڈا کے نفاذ کی خبر تھی اور وہ بھی اندر کے صفحے پر چھوٹی سی۔

''جو جی میں آئے کریں سالے''۔ بولتا ہوا پربھاکر اٹھا اور ڈرائنگ روم میں ٹہلنے لگا۔ ٹہلتا ہوا وہ ورانڈے میں بھی آجاتا۔ اس کی چال اس کے اضطراب کی غمازی کرتی تھی مگر قدموں کو اٹھانے اور چہرے کے تاثر سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مضطرب ہونے کے بجائے مطمئن ہونا چاہتا ہے۔

اس قسم کے خیالات کی رو پربھاکر کے دماغ میں دوڑ رہی تھی کہ جب ہی قانون نافذ کرنے والی خاتون آفیسر آگئی۔ وردی پیٹی میں کھٹ کھٹ کرتی۔ اسے کہیں اور یا جیل منتقل کرنے کے لیے شاید۔ پربھاکر نے کسی سراسیمگی کے بغیر کچھ زیادہ ہی باچھیں پھیلا کر اس کے استقبال میں مسکرایا اور اسے تپاک سے بیٹھنے کا آفر کیا جیسے یہ اسی کا گھر ہو۔ خاتون آفیسر دھم سے صوفے پر بیٹھ گئی اور گوگلس ہلاتے ہوئے پوچھا۔

''کیا حال چال ہیں؟''

''ٹھاٹ ہیں اور آپ ہی کی بدولت ہیں۔''

''ارے نہیں۔ آپ تو سٹائر کرتے ہیں۔''

''اس میں سٹائر کی کیا بات ہے میڈم؟''

''خیر، جانے دیجیے۔ سنائیے اور کیا خبر ہے؟''

''خبر تو کوئی خاص نہیں... آپ ہی کچھ بتائیں تو مہربانی ہو گی۔''

''کیوں۔ اخبار نہیں آتے کیا؟''

''آتے تو ہیں، لیکن اس میں اشتہار اور اعلان تو ہوتا ہے۔ خبر کہاں۔''

خاتون آفیسر مسکرائی۔ پربھاکر نے پوچھا۔

''یہ بتایئے مجھے کہاں شفٹ کیا جائے گا؟''

''شفٹ... ارے نہیں، آپ یہیں رہیں گے، جب تک چاہیں۔''

پربھاکر ''جب تک چاہیں'' کی چوٹ محسوس کر کے مسکرایا جس پر خاتون آفیسر کچھ خفیف سی ہو گئی اور یونہی ٹانگ ہلانے لگی۔ پھر اچانک۔ ''اچھا چلتی ہوں'' کہہ کر اٹھ پڑی۔ پربھاکر آج اسے ورانڈے کی دہلیز تک چھوڑنے آیا اور درخواست کی۔ ''امید کرتا ہوں کہ آپ سے ملاقات ہوتی رہے گی۔''

''او... شیور!''

وہ آگے بڑھی۔ گیٹ پر بیٹھے سپاہیوں میں جیسے نئی جان پڑ گئی۔ ان دونوں نے ایڑی بجاکر سلیوٹ مارا۔ خاتون آفیسر نے سر کی جنبش سے جواب دینے کے علاوہ ان کو کچھ ہدایت بھی دی جسے پربھاکر نہیں سن سکا۔

پابند اور مقید ہونے کا احساس بہت ستاتا ہے۔ پربھاکر اس احساس میں مبتلا کبھی بیٹھتا، کبھی اٹھتا، کبھی ٹہلتا رہتا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کبھی کبھی وہ اخبار اٹھالیتا مگر اس طرف بھی اس کی طبیعت مائل نہیں ہوتی تب کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتا۔

کھڑکی سے باہر نہ تو اسے صاف و شفاف نیلا آسمان بھا رہا تھا اور نہ لان میں بچھا گھاس کا سبزہ۔ حد نظر تک ویرانی تھی۔ البتہ گیٹ پر دو سپاہی نڈھال سے بیٹھے تھے۔ اسے گھر کا خیال آ گیا۔ اس نے سوچا کیوں نہ ٹیلیفون کو پھر سے آزمایا جائے۔ شاید درست ہو چکا ہو۔ مگر وہ بھی حسب سابق گونگا اور بہرہ ہی ملا۔ پھر اس نے غیر ارادی طور پر ماروتی کو آواز دی۔ کچھ زور دار لہجے میں۔ وہ حواس باختہ سا بھاگا ہوا آیا تو پربھاکر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کس لئے بلایا ہے اور کیا کہنا ہے۔ یوں ہی بے خیالی میں اس نے پوچھا۔

''کھانا تیار ہے؟''

"جی۔ کہہ کر ماروتی الٹے پاؤں پھرا مگر پربھاکر نے اسے پھر آواز دی۔

"دیکھو کھانا بعد میں لگانا۔ پہلے دیکھو یہ فون کیوں بگڑا ہوا ہے۔"

ماروتی نے نمبر گھما کر دیکھا مگر کوئی فرق نہیں۔ اس نے ساکٹ کو بھی چھیڑا تو بھی نتیجہ صفر۔ آخر میں بولا۔

"ڈیڈ لگتا ہے۔ کمپنی میں بولوں؟"

"اچھا بعد میں بولنا۔ پہلے کھانا لگاؤ۔"

کھانے کے معیار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ پربھاکر نے خوراک سے زیادہ کھایا جیسے کوئی انتقامی کارروائی ہو۔ پھر جا کر لیٹ گیا۔ وہاں طبیعت نہیں لگی تو ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔ یہاں صوفے پر لیٹ کر اخبار الٹنے پلٹنے لگا یہاں تک کہ اس کی آنکھ جھپکنے لگی۔ اخبار سے منہ ڈھک کر وہ سو گیا۔

صوفے پر الٹے سیدھے پڑے رہنے پر اس کے جسم میں تکلیف ہو گئی تھی۔ اسے جاگتے دیکھ کر ماروتی چائے لے آیا۔ چائے پی کر وہ لان میں گیا۔ وہاں چہل قدمی کرنے لگا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ یہاں پڑے پڑے مرغن خوراک کھاتے رہنا اچھا نہیں اس لئے کچھ ورزش کرنی چاہئیے۔ ورزش کے نام پر وہ لان میں دلکی چال چلنے لگا۔ ابھی ایک پھیرا بھی نہیں ہوا تھا کہ نڈھال سپاہیوں میں کہیں سے کرنٹ آگیا۔ وہ کڑکے، اور ایک بندوق تانے پیچھے ہولیا۔ یہ دیکھ کر پربھاکر فوراً رک گیا۔ خاتون آفیسر نے شاید ایسی ہی کوئی ہدایت دی تھی اس لئے چپ چاپ بنگلے کے اندر چلا آیا اور یہ طے کیا کہ ورزش تو ٹھیک ہے مگر ان ڈور۔ باہر انکاؤنٹر کے ڈرامے کا خدشہ ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ انہیں اگر کچھ کرنا ہی ہوگا تو باہر کیا اور اندر کیا۔ یہ اس کا کچھ گھر تو ہے نہیں کہ عافیت سے رہے گا اور گھر ہو بھی تو کیا ہوا۔ گھر میں گھس کر کیا یہ لوگ مار دھاڑ نہیں کرتے؟۔

پھر اسے اپنے گھر کا بھی خیال آنے لگا۔ صرف گھر کا نہیں بلکہ گھر کے تمام لوگوں کا۔ بیوی کا، بچوں کا۔ انہیں یاد کرنے کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ ان لوگوں سے رابطہ پیدا کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ دکھانے کو فون ہے تو کس کام کا۔

غرض کہ اسی قسم کی ادھیڑ بن میں لگا پربھاکر کبھی ٹہلتا تھا، کبھی بیٹھتا تھا۔ اس بے شغلی میں اسے سگریٹ پینے کی طلب ہوئی۔ مگر اس وقت سگریٹ پینے کو کہاں سے آسکتی تھی۔ چلتے وقت جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی، پھر بھی اس نے ماروتی کو بلا کر پوچھا۔

"ماروتی۔ یہاں کوئی کتاب وتاب نہیں ہے؟"

ماروتی ڈھونڈ ڈھانڈ کر لوٹا تو امپورٹ ایکسپورٹ کا ایک میگزین لے آیا۔ اسے دیکھ کر پربھاکر کو ہنسی آگئی۔ اس نے پھر پوچھا۔

"ماروتی۔ دھمرپان کرتے ہو؟"

"کیا صاحب؟"

"تم بیڑی سگریٹ پیتے ہو؟"

ماروتی نے شرما کرہاں نا میں جواب دینے کے بجائے الٹا یہ سوال کیا۔

"آپ کو مانگتا صاب؟"

پربھاکر نے خفیف سی مسکراہٹ سے حامی بھری تو ماروتی پلٹا اور چشم زدن میں امپورٹیڈ سگریٹ کا بیس کا پیکٹ اور ماچس لے آیا۔ پربھاکر نے حیرت ظاہر کی "ارے یہ کہاں آگیا؟" "یہاں رہتا ہے ناصاب۔ کوئی کوئی صاب کو لگتا ہے۔" پربھاکر کھانے وانے کے بعد ایک آدھ سگریٹ پیتا تھا مگر عام کوالیٹی کی کڑک والی امپورٹیڈ سگریٹ بالکل گھاس لگ رہی تھی۔ پھر بھی کش پر کش لیتا رہا۔ ماروتی نے جب کھانے کو پوچھا تو اس نے ہاں کردی۔

وہی شاہی ڈش۔

"اے ماروتی کون بناتا کھانا رے؟"

"اپن بناتا نا صاب۔"

"ارے واہ... تو تو بڑا گنی آدمی ہے۔"

ماروتی تعریف سن کر خوش ہو گیا۔ پربھاکر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ کھانے کے بعد ڈرائنگ روم سے بیڈروم تک کی لمبائی میں چہل قدمی کرتا ہوا اس نے ایک اور سگریٹ پی اور یہ طے کیا کہ اب جب یہیں رہنا ہے تو اسی شان سے کیوں نہ رہا جائے، اس لئے وہ غالیچے پر سونے کے بجائے بیڈ پر لیٹ گیا۔ گزشتہ رات کی بھی نیند آنکھوں میں باقی تھی اس لئے چند بار کروٹیں بدلنے کے بعد سو گیا۔

دوسرے دن بھی اس کا تقریباً وہی معمول رہا۔ دن کے کھانے کے بعد وہ پھر بیڈ پر لیٹا اور سو گیا۔

کافی دیر سو لینے کے بعد جب وہ اٹھا تو ڈرائنگ روم میں اس نے ایک ہوشربا منظر دیکھا۔ ایک بہت نوجوان اور دلکش لڑکی جس کے بال ترشے ہوئے تھے اور جو نیوی بلیو رنگ کا سلیولیس جمپر پہنے ہوئے تھی، ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی کتاب پڑھنے میں مستغرق تھی۔ اس کے چہرے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ پربھاکر نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر باتھ روم میں جاکر ہاتھ منہ دھونے لگا۔ کھٹ پٹ سن کر وہ لڑکی ہوش میں آگئی۔ جو کتاب وہ پڑھ رہی تھی اسے بند کر کے اس شخص کا انتظار کرنے لگی جس کی خدمت کے لئے اسے مامور کیا گیا تھا۔ پربھاکر جب ڈرائنگ روم میں آیا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر آداب بجالائی۔

پربھاکر نے سر کی جنبش سے جواب دیتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا

"کیا نام ہے آپ کا؟"

"مونیکا۔"

"مونیکا؟"

"یس سر... مونیکا سبھر وال۔"

پربھاکر سرنیم نہیں بلکہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کا نام سچ مچ مونیکا ہی ہے یا سور بولنے والی لڑکی مونیکا بولتی ہے۔ اس کے بیٹھ جانے پر بھی مونیکا کھڑی رہی جو اسے اچھا نہیں لگا۔ اس نے اسے بیٹھ جانے کو کہا اس نے بڑی سادگی سے کہا۔

"ٹھیک ہے سور۔ چائے لاؤں۔"

"آپ بیٹھو۔ چائے ماروتی لے آئے گا۔"

"کیا فرق پڑتا ہے سور... یہ تو ہماری ڈیوٹی ہے۔"

وہ واپس آئی تو پربھاکر نے پوچھا۔

"آپ کی یہاں ڈیوٹی لگی ہے، ڈیوٹی آورس کیا ہیں؟"

مونیکا کو آج ہی ذمہ داری سونپی گئی تھی اس لئے وہ یہاں دیر سے پہنچی تھی۔ اس نے گھبرا کر کہا۔

"آج دیر ہو گئی... کل سے..."

"نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔"

"ابھی کچھ کرنے کا ہے سور؟"

پربھاکر کا دھیان ٹیلیفون کی طرف گیا۔اس نے کہا

"یہ نہ کچھ بولتا ہے نہ سنتا ہے۔ فالتو میں پڑا ہوا ہے۔"

مونیکا نے اسے جانچنے پرکھنے کے بعد کہا۔

"یہ ڈیڈ ہے، کل ٹھیک کروادوں گی ۔"

کچھ سوچ کر پربھاکر نے کہا۔

"ٹیلیفون کو تو ماریئے گولی۔ آپ ہمارا ایک کام کریں گی؟"

"آف کورس سور!"

"دیکھئے جب سے میں یہاں آیا ہوں بیوی بچوں کی کوئی خیر خبر نہیں معلوم ہے۔ میں آپ کو ایک لیٹر دیتا ہوں۔ ہمارے گھر جا کر میری مسز کو دے دیجئے اور ان سے جواب بھی لکھوا لائیے۔"

پربھاکر نے گول مول زبان میں بیوی کو چٹھی لکھ کر سب کی خیرت اور احباب کی خبر پوچھی اور ساتھ ہی روپے پیسے کے بارے میں بھی دریافت کیا۔ مونیکا کو پتہ سمجھاتے ہوئے اس نے کہا کہ کل یہاں آنے سے پہلے اس پتے پر جائے اور وہاں کے حال احوال آ کر بتائے۔

چٹھی پاکر مونیکا بہت خوش ہوئی۔ پربھاکر نے مونیکا کو اس وقت واپس چلے جانے کی اجازت دے کر اسے اور بھی خوش کردیا۔ دوسرے دن سہ پہر تک مونیکا کی کوئی خبر نہیں ملی تو پربھاکر کو سخت کوفت ہوئی۔ اسے اپنے گھر بھیجنے سے تو اچھا تھا کہ ٹیلیفون ہی مرمت کروالیتا۔ لیکن مونیکا جب چہکتی چہکاتی واپس آئی تو اس کی ساری کوفت دور ہوگئی۔ بیوی نے بھی بڑی ہوشیاری سے جواب لکھا تھا اور یہ اطمینان بخش خبر دی تھی کہ اس کی گرفتاری کے دوسرے ہی دن اس کی پوری تنخواہ کے برابر رقم کوئی دے گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ دوستوں کی مہربانی ہو۔

مونیکا اس کے گھر سے بہت خوش لوٹی تھی۔

"سور۔ آپ کا گھر کتنا اچھا ہے۔"

"ہمارا گھر اچھا ہے۔ ارے کہیں اور تو نہیں چلی گئی تھیں آپ؟"

"نہیں سور۔ میرا مطلب ہے گھر والے کتنے اچھے ہیں۔ آپ کی مسز کتنی سویٹ ہیں۔"

پربھاکر نے دل میں کہا

"چل جھوٹی کہیں کی۔ کبھی تھی سویٹ۔ اب تو پھیکی بلکہ کڑوی ہو چلی ہے۔"

قصہ مختصر یہ کہ مونیکا نے ساری باتوں کو اس قدر تفصیل سے سنایا کہ پربھاکر کو خوشی ہوئی اور اس خوش گپی میں کافی دیر ہو گئی۔

"سور۔ ٹیلی ویژن لگاؤں۔ آج چترہار ہے۔"

پربھاکر کے ہاں یا نہیں کہنے سے پہلے مونیکا نے شوکیس کا ایک خانہ کھولا اور ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی چالو کر دیا۔ تھوڑی دیر تک پربھاکر رنگین تصویریں دیکھتا اور گانے سنتا رہا۔ مگر گانے اور دوسرے مناظر اس قدر شوخ بلکہ فحش تھے کہ کسی لڑکی کے ساتھ بیٹھ کر دیکھنا اس کے لئے مشکل ہو گیا۔ اس لئے وہ اٹھ کر باہر جانے لگا تو دروازہ سے لگا ماروتی بھی نظر آیا جو سر ہلا ہلا کر گانے سن رہا تھا۔

گانے جب ختم ہو گئے تو پربھاکر نے مونیکا سے کہا کہ اب تم گھر جاؤ مگر وہ اسے کھانا کھلا کر جانا چاہتی تھی۔ پربھاکر کے زور دینے پر وہ چلی گئی لیکن دوسری صبح بہت جلد آ گئی اور آتے ہی پربھاکر کے چائے، ناشتہ اور کھانے وغیرہ کا انتظام سنبھال لیا۔ اس کی خوش اخلاقی اور خدمت گذاری دیکھ دیکھ کر پربھاکر کو سخت حیرت ہو رہی تھی کہ پولس محکمے میں ایسے لوگ آئے ہیں یا یہ کوئی ریشمی جال ہے۔

موقع نکال کر اس نے پوچھ ہی لیا۔

"آپ اسی ڈپارٹمنٹ میں ہیں؟"

"یس سور۔ پی آر سیکشن میں۔"

"پولس کے پی آر سیکشن میں؟"

"نو۔ یونیورسل الیکٹرانکس کا پبلک ریلیشنز دیکھتی ہوں۔"

یونیورسل الیکٹرانکس کا نام سن کر پربھاکر کو جیسے کسی نے ڈنک مار دیا۔ ابھی کچھ دن پہلے اس کی مختلف یونٹ اور دفتروں پر چھاپے مارے گئے تھے اور اسپورٹ امپورٹ سے لے کر مالی گھپلے پکڑے گئے تھے۔ اس کمپنی کے مہمان خانے میں اسے لاکر رکھنے کا کیا مطلب۔ یہ سرمایہ اور سیاست کا کیا رشتہ ہے۔

مونیکا بہر حال آتی اور اس کا دل بہلاتی رہی۔ اب تو یہ حال ہو گیا تھا کہ اسے آنے

میں دیر ہوتی تو پربھاکر بے چینی محسوس کرنے لگتا تھا۔ وہ اسے چہک چہک کر بولتے دیکھتا رہتا اور کبھی کبھار کوئی سوال کر بیٹھتا۔ مونیکا بھی اس کے بارے میں پوچھتی رہتی اور اپنی رائے بھی دیتی جاتی۔ پربھاکر کی خوش اخلاقی کے علاوہ اسے اس بات کی بھی بہت خوشی ہوئی تھی کہ پربھاکر ایک اہم ٹریڈ یونین لیڈر ہے۔ لیکن ایک دن اس نے باتوں باتوں میں اس بات پر سخت حیرت کا اظہار کیا کہ پربھاکر اتنا بڑا ٹریڈ یونین لیڈر ہوتے ہوئے بھی اس جگہ کیوں رہتا ہے؟ جہاں اس کے بیوی بچے ہیں۔ اس کی کمپنی کے ٹریڈ یونین لیڈر تو بڑے ٹھاٹ باٹ سے رہتے ہیں۔ بالکل کمپنی کے ڈائریکٹروں کی طرح۔ ہوائی جہاز سے سفر کرتے اور فائیو اسٹار ہوٹلوں میں میٹنگ لیتے ہیں اور ہوٹلوں ہی میں نہیں گھر پر بھی ڈرنک لیتے ہیں۔

مونیکا کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ پربھاکر پر وہ کچھ ترس نہیں کھاتی بلکہ اس کی مداح ہے۔ تاہم اسے خوش اور بے فکر بھی دیکھنا چاہتی تھی۔ اس لئے اس کے کھانے پینے کا پہلے سے بھی بہتر انتظام کرنے کے علاوہ کپڑے لتے، بستر چادر کی بھی دیکھ بھال کرتی۔ اس کی دل بستگی کا اہتمام کرنا بھی نہیں بھولتی تھی۔ مثلاً اس کے لئے نت نئے رسالے، میگزین اور کتابیں بھی لاتی۔ وہ چاہتی تھی کہ پربھاکر ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں سے بھی دلچسپی لے اور اپنے سنسان وقت کو کاٹنے کے لئے وہ تھرلر اور بیسٹ سیلرز بھی پڑھے جس میں وہ خود ڈوبی رہتی تھی۔

پربھاکر نے جب یہ کہا کہ مجھے ان سستی اور سنسنی خیز کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں تو مونیکا نے اس کے انکار کو تسلیم نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ کل میں آپ کو ایک کتاب لا کر دوں گی۔ پتلی سی کتاب ہے۔ اسے پڑھ جایئے تو آپ بھی ان کتابوں میں دلچسپی لینے لگیں گے۔

پربھاکر اس سے بحث یا تکرار نہیں کیا کرتا تھا بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ بولنے دیتا تھا۔ وہ بولتی تھی تو لگتا کہ کل کی گویا گڑیا بول رہی ہو۔ پربھاکر کو غور سے سنتے دیکھ کر اسے جب ایسا لگتا کہ وہ بور ہو رہا ہے یا اس پر غنودگی طاری ہو رہی ہے تو وہ جھٹ سے چائے بنوا لاتی۔ سگریٹ کے رہتے ہوئے بھی امپورٹیڈ سگریٹ کے دوسرے ڈبے لے آتی تھی۔

بے شغلی میں پربھاکر کو بھی یہ باتیں پسند آتی تھیں۔ اب اسے امپورٹیڈ سگریٹ کے پینے میں بھی مزہ آنے لگا تھا اور مونیکا کی اخلاق مندی بھی اس کے دل میں گھر کرتی جا رہی تھی۔

مگر جس دن مونیکا پربھاکر کے لئے وہ چھوٹی سی پتلی سی دلچسپ کتاب لائی اس دن اسے ایک دھچکا سا لگا۔

دن تو خوش گپیوں اور ریڈیو ٹی وی کے پروگرام میں گزر گیا پر رات کے کھانے کے بعد

جب پربھاکر نے اس کتاب کی ورق گردانی کی تو اس کے خون کی روانی بڑھ گئی۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ مونیکا غایت معصومیت میں یہ کتاب اٹھا لائی ہے۔ لیکن پھر اسے لگا کہ اتنی بڑی فرم کے پبلک ریلیشنز دیکھنے والی یہ گڑیا جیسی لڑکی ایسی معصوم نہیں۔ تاہم کتاب چونکہ واقعی دلچسپ اور رومانٹک تھی اس لئے وہ رات گئے تک اس کا مطالعہ کرتا رہا۔ اور کتاب ہاتھ میں لئے ہوئے سو گیا۔

سوتے میں اس نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے گھر میں ہے۔ بیوی بچے اسے دیکھ کر بہت خوش ہیں۔ بیوی کچھ زیادہ ہی نثار ہو رہی ہے۔ یہاں تک کہ بے تکلفی کی بھی گھڑی آ گئی اور . . .

آنکھ کھلنے پر اسے تھوڑی شرمندگی ہوئی کیونکہ ۴۵ سال کے آدمی کا کپڑا جو خراب ہو گیا تھا۔

مونیکا اس کے جگنے سے پہلے آ چکی تھی اور کھٹ پٹ کرتی ہوئی ایک جادو سا جگائے ہوئے تھی۔ پربھاکر بستر سے سیدھا باتھ روم چلا گیا۔ نہا دھو کر باہر آیا تو اسے یہ دیکھ کر بڑی شرم آئی کہ آج مونیکا نے چادر کی سلوٹیں دور کرنے پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ چادر بھی بدلوا دی تھی۔ اس لڑکی سے نظریں ملانے میں وہ جھجھک محسوس کر رہا تھا۔ مگر مونیکا پر ایسا کوئی رد عمل نہیں تھا۔ وہ ناشتہ کی میز پر بلا رہی تھا۔

چائے کی پیالی پر ہونے والی گپ شپ کے دوران اس نے پوچھا بھی کہ پربھاکر کو وہ کتاب کیسی لگی۔ پربھاکر تو اس سے نظریں بھی نہیں ملا سکا۔ بس ویسے ہی کھِنچی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ اتنا کہہ سکا۔ ''اچھی لگی۔''

اب مونیکا کچھ زیادہ ہی گرم جوشی دکھانے لگی۔ پربھاکر کو بھی اس کا یہ اپنا پن جچنے لگا۔ بلکہ وہ تھوڑی دیر کے لئے بھی ادھر ادھر ہوتی تو وہ کمی محسوس کرنے لگتا۔ اس کا چہکنا تو اسے اچھا لگتا ہی تھا اب وہ بھی اس کی گفتگو میں حصہ لینے لگا۔ بلکہ اس کے متعلق بھی پوچھ تاچھ کرنے لگا۔ گویا دوری کم ہونے لگی اور دونوں قریب سے قریب تر ہونے لگے۔

ایک دن مونیکا نے آتے ہی جب یہ کہا کہ آج وہ کچھ دیر کے لئے اپنے آفس جائے گی۔ آج پے ڈے ہے۔ تب پربھاکر کو احساس ہوا کہ ایک مہینہ گزر گیا۔ وقت اور دن کے گزرنے کا اسے احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔

مونیکا کی غیر حاضری میں پربھاکر پر ایک انجانی سی بے چینی طاری رہی۔ نہ کسی رسالہ میں اس کی طبیعت لگ رہی تھی اور نہ کسی کتاب میں۔ کبھی ریڈیو کھولتا تھا اور کبھی بند کرتا تھا۔ ماروتی نے کھانا لگایا تو باوجودیکہ اور دنوں کی طرح خوش ذائقہ تھا مگر پربھاکر کو اچھا نہیں لگا۔ اس پر بے کیفی طاری رہی۔ ایک طرح کی مایوسی بھی ... یہ سوچ کر کہ آج پے ڈے ہے ... تنخواہ لینے کے بعد وہ

گھر جائے گی۔ یہاں لوٹ کر شاید نہ آئے۔

مگر دن ڈھلے جب مونیکا آئی تو اسے بڑی مسرت انگیز حیرت ہوئی۔ مسرت مونیکا کے آنے پر اور حیرت اسے لدی پھندی دیکھ کر۔ مگر اس نے کچھ پوچھا نہیں۔ مونیکا نے خود امپورٹڈ سگریٹ کا ایک کارٹن نکال کر اسے دیا اور پھر اپنے بیگ کی طرف پلٹ کر کچھ نکالتے نکالتے رک گئی۔

ایک جھجک کے ساتھ اس نے پربھاکر سے پوچھا۔

"سور... آپ ڈرنک نہیں کرتے؟"

پربھاکر کو اس کی بے تکلفی پر حیرت ہوئی مگر اس نے خود کو سنبھالا۔ یار دوستوں کی محفل یا سیمنار اور کانفرنس میں وہ دو ایک جام چڑھالیا کرتا تھا۔ مگر وہ ایک تو اس خیال سے ڈرنکس سے اسے رغبت نہیں تھی کہ وہ افورڈ نہیں کر سکتا اور دوسرے وہ شراب وراب کے چکر میں پڑتا تو مزدوروں پر اچھا اثر نہیں پڑتا۔

مونیکا کے سوال کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا تب مونیکا نے دوبارہ سوال ہی نہیں بلکہ تھیلے سے ایک کنگ سائز کی بوتل بھی نکالی ... جانی واکر کی بوتل۔

پربھاکر نے جانی واکر کبھی چکھی تھی۔ اچھی شراب کو وہ خوبصورت شراب کہا کرتا تھا۔ تو اسی خوبصورت شراب کی بوتل دیکھ کر وہ تقریباً کھل اٹھا مگر پھر ضبط کر گیا۔

لیکن مونیکا کو جیسے عندیہ مل گیا۔ وہ کھٹ کھٹ کرتی گلاس لانے گئی تو ماروتی سے سوڈا لانے کے لیے بھی کہتی آئی۔ اس نے سونا تولنے کے انداز سے گلاس میں شراب ڈالی اور سوڈا ملا کر گلاس تھامے پربھاکر کے صوفے کی طرف بڑھی جہاں پربھاکر سانس روکے بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

لباب جام لے کر مونیکا کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر پربھاکر نے نہایت بے ساختگی سے اسے رک جانے کو کہا جیسے اسے جام کے نہیں مونیکا کے چھلک پڑنے کا اندیشہ ہو۔ مونیکا جہاں کی تہاں تھم گئی اور پربھاکر کو خود صوفے سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھنا پڑا۔

اپنے صوفے سے اٹھ کر پربھاکر کو مونیکا کی طرف بڑھنے میں اتنا ہی سنکوچ اور کشٹ ہوا جتنا سنکوچ اور کشٹ آسن بھنگ کر کے مرگ چھالا سے اٹھنے میں وشوامتر کو ہوا ہوگا۔

❖ ❖ ❖

سیوک

یہ ایک اکیلی عورت سونندہ ہی کا دم خم تھا جو اکٹھے ایک نہیں دو مردوں کو ساتھ لے کر چل رہی تھی۔ ایک مرد تو دو باش تھا جس کے بارے میں دنیا جانتی تھی کہ وہ اس کا پتی ہے۔ سات پھیروں کے بعد اس کی زندگی میں داخل ہونے والا پہلا مرد اور دوسرا مرد تھا ولاس۔ دنیا کی نظروں میں ولاس اس کا سوامی نہیں سیوک تھا مگر سونندہ نے اسے اب کوئی اور درجہ دے دیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس حقیقت سے ابھی اس کے علاوہ دو باش ہی واقف تھا۔

یہ حقیقت جاننے کے بعد دو باش انگاروں پر لوٹ رہا تھا اور خود ولاس بھی پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ سونندہ کبھی دو باش کو دیکھ آتی تھی جو ان لوگوں کے مشترکہ بیڈ روم میں کانٹوں کے بستر پر پڑا کروٹیں لے رہا تھا اور کبھی ولاس کو کچن میں دیکھ آتی تھی۔ باوجود یہ کہ کچن ہی ولاس کا ہمیشہ سے ٹھکانا رہا تھا.... ہمیشہ سے کہیئے تو برسوں سے نہیں دسیوں برس سے جہاں وہ گھر کے سارے کام بھی انجام دیتا تھا اور آرام بھی کرتا تھا اور ادھر کچھ دنوں سے وہیں بیٹھ کر کچھ لکھا پڑھا بھی کرتا تھا۔ پر آج وہی کچن اس کے لئے جیل خانے سے کم نہیں تھا۔ وہ اس کمرے میں بند کر دیا گیا تھا اس لئے کسی قیدی ہی کی طرح تڑپ رہا تھا۔

سونندہ ان دونوں مردوں پر نظر رکھنے کے علاوہ دوسرے بیڈ روم میں آرام کرتے اپنے تینوں بچوں کو بھی دیکھ آتی تھی۔ یوں تو ہمیشہ ہی رات میں دو تین بار اٹھ کر وہ اپنے بچوں کو دیکھتی اور ان کے تکیئے اور چادریں درست کیا کرتی تھی۔ مگر آج ان کی دیکھ بھال کا انداز ہی کچھ اور تھا۔ حالانکہ ان بچوں کے لئے اگر وہ اتنی بے چینی نہیں بھی دکھاتی تو کوئی حرج نہیں تھا۔ کیونکہ بڑا لڑکا ورون انجینئرنگ کے دوسرے سال اور عمر کے اکیسویں سال میں داخل ہو چکا تھا۔ چھوٹی بچی بے بی البتہ چھوٹی تھی۔ سات آٹھ سال کی جس کی زیادہ خبر گیری کی ضرورت تھی۔ مگر سونندہ کو بے بی کی جو لڑکی ہونے کے علاوہ چھوٹی بھی تھی اتنی فکر نہیں تھی جتنی دوسرے لڑکے وشال کی تھی کیونکہ سونندہ اسے ڈاکٹر بنانے کا خواب دیکھتی آئی تھی اور.....

جو لوگ سونندہ سے واقف تھے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ خوابوں کی دنیا میں رہنے والی

ہستی نہیں تھی۔ تاہم وہ اپنی اور اپنے لواحقین کی زندگی کو پر مسرت اور با مقصد ضرور بنانا چاہتی تھی اور اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے منصوبے بناتی اور ان منصوبوں میں عمل کا رنگ بھرنے کا حوصلہ بھی رکھتی تھی۔

اب جیسے اسی کو لیا جائے کہ اچھے نمبروں سے بی اے کرنے کے بعد وہ جو چاہتی تھی وہ حاصل نہیں کر سکی تو اس نے پالیٹکل سائنس میں ایم اے جوائن کر لیا۔ اور باپ ماں کے بوجھ کو کم کرنے کیلئے دھڑلے سے ٹیوشن کرنے لگی تھی۔ دوسرے سال اسے بی ایڈ میں ایڈمیشن مل گیا تو یونیورسٹی کی دلچسپیوں اور رنگینیوں کی مطلق فکر کئے بغیر وہ بی ایڈ کرنے لگی تھی۔ کیونکہ ان دنوں مینجمنٹ یا کمپیوٹر کا چلن نہیں ہوا تھا اور ملازمت کی خواہشمند لڑکیاں زیادہ سے زیادہ ٹیچنگ لائن میں جا سکتی تھیں جس کے لئے بی ایڈ کرنا ضروری ہوتا تھا اور اتفاق دیکھئے کہ بی ایڈ کرتے ہی اسے اسی اسکول میں ٹیچنگ جاب بھی مل گئی جہاں سے وہ خود پڑھ کر نکلی تھی۔

سوننده کا جس طبقہ سے تعلق تھا اس طبقہ سے تعلق رکھنے والوں کی زندگی میں اتفاق یا قسمت کا بھی خوب کھیل ہوتا ہے جب ہی تو نوکری کرتے کچھ ہی دن گزرے تھے کہ سوننده کی شادی کا سنجوگ نکل آیا۔

جو لوگ اب اس کی شادی کی بات چلا رہے تھے وہ پہلے بھی سوننده اور اس کے گھر والوں سے واقف تھے مگر اب سے پہلے ان میں سے کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی تھی کہ اس کی شادی کا پیغام لاتے۔ اب اسے اتفاق کہا جائے یا قسمت کہ ان مہربانوں کی کوششوں سے جس شخص کو اس کا جیون ساتھی چنا گیا وہ سوننده کے لئے جوگا جوگ ہی نہیں بلکہ اس کے اور اسکے گھر والوں کی توقع سے کہیں زیادہ تھا کیونکہ وہ کلاس ون سرکاری افسر تھا اور اس کا کوئی مطالبہ یا جہیز وہیز کی کوئی شرط نہیں تھی سوائے اس کے کہ لڑکی تعلیم یافتہ، خوبرو، گھریلو اور سلیقہ مند ہو۔

سوننده ان ساری شرطوں پر پوری اترتی تھی یہ بتانے اور سوننده کو بھی اپنے ہونے والے پتی یا سوامی کو ایک نظر دکھانے کیلئے ایک تاریخ مقرر کی گئی۔ جس کی وجہ سے سوننده کی زندگی اور اس کے گھریلو ماحول میں کچھ ہلچل سی پیدا ہو گئی۔ ٹھہری ہوئی زندگی میں یہ ہلچل بھی کم نہیں تھی۔ کیونکہ ایک اہم فرض کی ادائیگی کی ذمہ داری عائد ہو گئی تھی۔ اس دوران طرح طرح کی باتیں ہوتیں اور مشورے کئے جاتے تھے۔ ان ہی میں سے ایک بات اس کے کان میں یہ بھی پڑی کہ ساس نند کا کوئی جھمیلہ نہیں ہے۔ لڑکا اکیلا ہی ہے۔ سوننده خود اس کو کوئی خوش قسمتی نہیں سمجھتی تھی کیونکہ چار چھ بھائی بہنوں کے بیچ اور پھر چچیرے ممیرے رشتہ داروں کے ساتھ زندگی بسر

کرنے کی وہ عادی تھی۔

خیر مقررہ تاریخ کو اسے بنا سنوار کر چائے کے ساتھ اس جگہ بھیجا گیا جہاں سونندہ کے رشتہ داروں کے ساتھ دوباش بیٹھے تھے۔ دوپسلی کے آدمی تھے۔ انہوں نے بھی بھری مست جوانی والی ایک کوالیفائیڈ لڑکی کو دیکھا تو کچھ سہم سے گئے مگر پسند کئے بغیر بھی نہیں رہے۔ ادھر سونندہ نے دوپسلیوں والے اس کلاس ون آفیسر کو جس کا اس شہر میں دو بیڈ روم ہال کا اپنا فلیٹ بھی تھا دیکھا تو باوجود اس کے کہ اس کے سر کے بال کم ہو چکے تھے اور عمر میں اس سے دس بارہ سال بڑا تھا برمالا پہنانے کی آمادگی ظاہر کر دی۔

- - - - -

یہ جس زمانہ کا قصہ ہے اس زمانہ میں کورس کو تو جانے دیا جائے ٹیچروں کے لئے بھی یہ ضروری نہیں تھا کہ ٹیچنگ میتھڈ میں سیکس کا دور دور بھی ذکر ہو اور پھر کیبل ٹی وی کا بھی ایسا کوئی جال نہیں پھیلا تھا کہ نچلے درمیانہ طبقہ کے لڑکے اور لڑکیاں جنس اور جسم کے راز سے واقف ہوں۔

اس لئے دوباش سونندہ کی بھرپور جوانی کو دیکھ کر پہلی ہی نظر میں جو سہمے تھے اور اسے قابو میں لانے اور اس کا دل جیتنے کے لئے ہنی مون منانے شہروں اور پہاڑوں پر لے گئے تھے وہ نسخہ کارگر ثابت ہوا اور مرد عورت کے تعلقات سے ناواقف سونندہ ایک ڈیڑھ مہینے کے بعد جو لوٹی تو بھری پری لوٹی۔ اس کا اگر بس چلتا تو دوسے تین بننے میں اتنی جلدی نہیں دکھاتی مگر اب تو......

دوباش اس کی دلداری ہی نہیں ناز برداری بھی کم نہیں کیا کرتے تھے۔ اس لئے ان کے کہنے پر سونندہ کو اسکول سے چھٹی پر چھٹی لینی پڑی۔ ورون کے آنے پر تو اسے مکمل آرام کیلئے مجبور کیا گیا جبکہ وہ اس کی عادی نہیں تھی۔

یوں بے کار بیٹھے رہنا اسے بالکل پسند نہیں آتا۔ مگر چارہ کیا تھا۔ بچے کو تنہا چھوڑا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ایسے وقت میں اسے ساس نند کا خیال آتا تھا۔ کاش اس کی ساس اگر زندہ ہوتیں تو اسے نہ اس قدر پابند ہونا پڑتا اور نہ اسکول کی نوکری چھوڑنی پڑتی۔

خالی اوقات تو اسے کاٹنے کو دوڑتے اس لئے خود کو مشغول رکھنے کے لئے اسے کلاس ون آفیسر کی بیوی بن کر گپ شپ اور شکوہ شکایت کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ کچھ وقت اخبار، فیشن میگزین اور کام شاستر گربھ شاستر جیسی کتابیں پڑھنے میں بھی گزارتی۔

اس کا اچھا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اب اناڑی نہ رہی تھی۔ **فیملی پلاننگ کے ہر گر سے واقف**

ہو گئی تھی۔ واقف ہی نہیں کچھ ڈھیٹ بھی ہو گئی تھی اور بے تکلفی کے لمحات میں جب دوباش کو یہ جتادیتی تھی تو وہ بے چارہ پھر سہم جاتا حالانکہ سونندہ زندگی کے ہر معاملہ میں نہایت محتاط اور نرم خو عورت تو تھی ہی بستر پر بھی دو تین سال تک میدانی ندی ہی کی طرح بہتی رہی۔

لیکن ایک بات ایسی تھی جو اسے تڑپادیتی تھی۔ اس کی اور دوباش کی دلبستگی کا ہر قسم کا سامان موجود تھا۔ بلکہ اب تو بڑے شہروں میں دوردرشن کے نام پر خوشحال علاقوں میں ٹی وی کا انٹینا بھی دکھائی دینے لگا تھا مگر افسروں کے اس علاقہ میں ورون کی عمر کایااس سے سال دو سال بڑایا چھوٹا بچہ کوئی نہیں تھا۔ جس کے ساتھ کھیل کر اس کا دل بہلتا۔ باپ ماں کالاکھ لاڈ پیار ہو بچے کو اپنے جیسا کوئی ساتھی بھی چاہئے۔ ورنہ اس کی نفسیات اور فطرت پر خراب اثر پڑ سکتا ہے۔ بی ایڈ کلاس میں پڑھائی جانے والی چائلڈ سائیکولوجی کی کتابوں میں پڑھی ہوئی باتوں کا خیال آتا تو ورون کے لئے وہ تڑپ کر رہ جاتی تھی ......

لیکن جو لوگ سونندہ سے واقف تھے وہ جانتے تھے کہ وہ خوابوں کی دنیا میں رہنے والی ہستی تھی اور نہ جذبات کے ریلے میں بہہ جانے والی عورت۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا پتی ایک ایماندار آفیسر ہے جبکہ عام لوگوں کے نزدیک ایمانداری کسی وصف کا نام نہیں کم ہمتی کا نام ہے۔ تنخواہ اور جائز بھتہ کے علاوہ اس کی کوئی اور آمدنی نہیں ہے اور اس کی آمدنی میں اسے خریدے گئے مکان کی قسط بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ اوپر سے ہنی مون کیلئے اس نے پی ایف سے بھی بڑی رقم نکال لی ہے۔

تب کسی مہمان کو بلانے اور مزید خرچ بڑھانے کا مطلب تھا کہ چادر کے باہر پاؤں نکالے۔ سونندہ کو اپنے جذبات کا گلا گھونٹنا منظور تھا، چادر سے باہر پاؤں پھیلانا نہیں.... خواہ کتنا بھی تڑپنا اور مچلنا کیوں نہ پڑے۔

- - - - -

مگر اتفاق یا قسمت نے پھر سونندہ کی زندگی میں ایک عجیب کھیل کھیلا۔

ہوا یہ کہ ایک شام جب دوباش دفتر سے لوٹے نہیں تھے اور وہ ورون کے اکیلے پن کو مٹانے اور خود تنہائی سے پریشان بچے کو گود میں لئے کمپاؤنڈ میں ٹہلتی ہوئی کچھ گنگنا رہی تھی کہ کوئی شخص، شخص کیا ایک نوجوان گیٹ پر نظر آیا جسے واچ مین نے روک رکھا تھا۔

سونندہ تو پہلی نظر میں اسے نہیں پہچان سکی مگر وہ نوجوان شاید اسے پہچان گیا تھا۔ اس لئے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ واچ مین سے کچھ کہہ رہا تھا۔ سونندہ کے قریب آکر اس نے

اپنا تعارف کرایا تو وہ بھی اسے پہچان گئی۔ وہ اس کی ننیہال کا رہنے والا اور کہار ذات کا نوجوان تھا۔ یہ لوگ پشت در پشت اس کے نانا اور ماموں کی کاشت اور گھر سے وابستہ تھے اور اب شہر کا رخ کر رہے تھے۔

بات چیت کے دوران ورون لپک کر اس کی گود میں ایسا گیا کہ ماں کے بلانے پر بھی نہیں آ رہا تھا۔ خیر جب تک دوباش نہیں آ گئے سونندہ بھی اسے گھر نہیں لے گئی۔ دوباش کے ساتھ وہ سب اوپر گئے تو وہ ایک کنارے ہی کھڑا رہا اور بیٹھنے کے لئے کہا گیا تو کارپیٹ کے کنارے بیٹھ گیا۔ سونندہ نے اسے چائے ناشتہ تو دیا مگر کانسے کے برتن میں جسے اس نوجوان نے دھو کر رکھا۔ پتہ یہ چلا کہ وہ ساتھ آٹھ کلاس تک پڑھا ہے اور یہاں نوکری کی تلاش میں آیا ہے۔ اس کے ماں باپ نہیں رہے۔ وہ ان کا اکیلا لڑکا ہے۔ بہنوں کا بیاہ ہو چکا ہے۔

سونندہ نے دوباش کی طرف دیکھا تو اس نے کل آنے کو کہا۔ وہ لوٹنے لگا تو سونندہ اسے دس کا ایک نوٹ دینے لگی جسے اس نے لاکھ کہنے پر نہیں لیا۔

رات کے کھانے کے بعد معمول کے مطابق جب یہ دونوں میاں بیوی چہل قدمی کرنے نکلے تو سونندہ نے دوباش کو بتایا کہ اس لڑکے ولاس کا پورا خاندان اس کی ننہیال میں پلتا تھا۔ اور عوض میں گھر اور باہر کا سارا کام یہی لوگ نپٹایا کرتے تھے مگر بہت دنوں کے بعد آخری بار جب اسے اپنی ایک ممیری بہن کی شادی میں وہاں جانا پڑا تھا تو اسے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ گاؤں اب وہ گاؤں نہیں رہا تھا۔ وہاں کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ پچھڑی ذات کے یہ لوگ جو اب دلت کہلانے لگے تھے، کاشتکاروں کے بندہ بے دام ہوا کرتے تھے مگر اب مقابلہ پر اتر آئے تھے اور سرکار کی مقرر کردہ نرخ پر اجرت کا مطالبہ کرنے لگے تھے۔ انہیں اگر وہ مزدوری ملتی تھی تو کام کرتے تھے ورنہ کام کی تلاش میں یہ لوگ شہر بھاگنے لگے تھے اور جو بھاگے نہیں تھے وہ اپنے حق اور عزت کی لڑائی لڑنے لگے تھے۔ ہتھیار بند لڑائی۔ سخت سے سخت سزا جھیلنے والے اب خون خرابہ پر اتر آئے تھے۔ یہ لوگ بہت جفاکش اور وفادار بھی ہوتے ہیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ اسے گھر کے کام دھام کے لئے رکھ لیا جائے مگر اب ڈر لگتا ہے۔

یہ سن کر دوباش نے کہا تھا.... خیر جو خون خرابہ کے اہل نہیں تھے وہ شہروں کی طرف بھاگ آئے ہیں لہٰذا ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کل سے تم اسے اپنے یہاں کام پر لگا لو.... تم کب تک جان کھپاتی رہو گی؟"

دوباش کے ہمت دلانے پر سونندہ نے ولاس کو اپنے یہاں کھانے پینے، تنخواہ اور رہائش

کی پیشکش کی تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔ اسکول میں آٹھویں تک پڑھنے کے باوجود سونندہ کے گھر میں اس نے بڑی تندہی اور سلیقے سے کام کیا۔ اس نے گھر کا ہر چھوٹا بڑا کام اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ پھر بھی ماتھے پر بل نہیں آنے دیتا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ اس کی طرح جو لوگ گاؤں چھوڑ کر شہر آتے تھے انہیں جان توڑ محنت کرنی پڑتی تھی۔ ہاتھ گاڑی سے لے کر رکشہ کھینچنا پڑتا یا حمالی کرنی پڑتی تھی۔ سارا دن محنت کرنے پر بھی اتنا ہی ملتا تھا کہ مشکل سے گذر بسر ہو سکے۔ رہنے کیلئے گندی بستیوں کی خستہ حال جھونپڑیاں میسر ہوتی تھیں اور جو بھٹے پر کام کرنے پنجاب میں کہیں جا پڑے تھے ان کی حالت تو گاؤں سے بھی بدتر تھی۔ بلکہ وہاں انہیں بندھوا مزدور بنا کر رکھا گیا تھا۔

اوروں کے برخلاف اس کی زندگی بڑے عیش سے گزر رہی تھی۔ یہاں صاف ستھرا مکان، گھن گھناتا ٹیلی فون اور جادو کا بکسا ٹی وی بھی تھا جس پر طرح طرح کے تماشے دیکھنے میں آتے تھے۔ سونندہ کے حسن سلوک اور امید افزا باتوں کے طفیل کچھ بہتر مستقبل کا خواب دیکھنے کی گنجائش الگ تھی۔

ولاس کی خدمت گذاریوں کے طفیل سونندہ کو فرصت کے جو رات دن نصیب ہوئے تو اس نے اس وقت کا صحیح مصرف کا منصوبہ بنایا۔ یعنی کے ایم اے کا کورس مکمل کرنے میں لگ گئی تاکہ کالج میں جگہ مل جائے۔ اس کا کوئی کام مقصد سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ سو ایم اے کرنے کے فوراً بعد اسے ایک جونیئر کالج میں لکچرر شپ بھی مل گئی۔ دوباش کو ذرا دوری بلانی پڑی تھی۔ اس کی بدولت سونندہ کے سماجی رتبہ میں جو اضافہ ہوا وہ تو ہوا ہی آمدنی بھی بڑھی۔ آمدنی بڑھی تب ورون کیلئے ایک اور ساتھی کا انتظام کرنے کا بھی خیال آیا۔ چار سال کے انتظار کے بعد ورون کا جو ساتھی آیا اس کا نام وشال رکھا گیا۔

ولاس کی بدولت سونندہ کو گھریلو کاموں سے تو چھٹکارہ ملا ہی تھا دونوں بچوں کی طرف سے بھی بے فکری ہو گئی تھی۔ ولاس ان کی خوب اچھی طرح نگہداشت کرتا تھا اور دونوں بچے ورون اور وشال بھی اس سے اس طرح مانوس ہو گئے تھے کہ انہیں ماں کی کمی شاید ہی محسوس ہوتی تھی۔

آدمی کو سکھ چین ملتا ہے تو وقت بھی بڑی تیزی سے گذرنے لگتا ہے۔ سونندہ کو بھی پتہ ہی نہیں چلا کہ پلک جھپکتے ہی اتنے سال گذر گئے۔ ہاں اس وقت کچھ ہوتا تھا جب ولاس اسے یہ یاد دلاتا تھا کہ صاحب سے کہہ کر اسے کوئی سرکاری نوکری دلا دی جائے۔ سونندہ ایسی غلطی بالکل نہیں کرنا چاہتی تھی مگر وہ ولاس پر اپنا عندیہ ظاہر کرنے کے بجائے جھوٹی یقین دہانیوں پر اس کی جان

ٹکائے رہتی تھی۔ ولاس کا تقاضہ جب بڑھتا تھا تو وہ کوئی نہ کوئی بہانا بنا دیتی تھی۔ جیسے یہی کہ تم نے زیادہ پڑھا بھی تو نہیں ہے۔ آج کل تو بی اے ایم اے پاس معمولی نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ تم ایسا کرو کہ آنے والے سیشن میں نائٹ اسکول میں نام لکھا لو۔ کم از کم ہائی اسکول کر لو گے تو صاحب کو تمہیں نوکری دلوانے میں آسانی ہو گی۔ اولاً تو ولاس کو اسکول جوائن کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا اور اگر وہ بہت ضد کرتا اور اس کا نام نائٹ اسکول میں لکھا بھی دیا جاتا تو تین چار سال تو اور آسانی سے نکل ہی جاتے اور اس بیچ دونوں بچے بھی خاصے ہوشیار ہو جاتے۔

اسی دوران ولاس کی ایک بہن نے خط لکھوایا کہ اس کی عمر کب کی ہو چکی ہے اس لئے اب اس کی شادی ہو جانی چاہئے۔ یہ بات صحیح بھی تھی کیونکہ کہ ولاس جب سونندہ کے یہاں آیا تھا اس وقت وہ سترہ اٹھارہ سال کا ہو چکا تھا مگر وہ جو کہا جاتا ہے نا کہ غریب کے لڑکے دیر سے جوان ہوتے ہیں اور جلد بوڑھے ہو جاتے ہیں تو ولاس پر بھی اس کا اطلاق ہوتا تھا۔ وہ جب آیا تھا تو سوکھا سا کھا سا ایک لڑکا تھا مگر سونندہ کے یہاں اسے جو اطمینان و آرام ملا تو اس کی جوانی بھی چمک اٹھی تھی۔

سونندہ نے دوباش سے مشورہ کیا تو اس نے بھی کہا اس کی شادی کروا ہی دو۔ اس کی کئی سال کی تنخواہ تو ہم لوگوں کے پاس جمع ہی ہے۔ اتنے میں یہ دھوم دھام سے شادی رچا سکتا ہے۔ مگر سونندہ نے جاتے وقت اپنی طرف سے بھی اچھی خاصی رقم اور اسکی ہونے والی بیوی کے لئے تحفے دیئے۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ آرام کی زندگی گزارنے کے بعد اس کی قوت پرواز کم ہو ہی چکی ہے شادی کے بندھن میں بندھنے کے بعد اس کی رہی سہی قوت بھی جاتی رہے گی۔

ولاس جب تک شادی کر کے نہیں آیا سونندہ کو الجھن ہوئی۔ اس کی زندگی کا جو معمول بن گیا تھا وہ گڑبڑا گیا مگر ولاس کے آنے تک تو اسے ان جھمیلوں سے نپٹنا ہی تھا۔ جھمیلے بھی کیا کسی دوسرے کے تھے۔ اس کی گرہستی اور اس کے بچوں ہی کے تھے۔ اس دوران اسے اپنے بچوں سے لاڈ پیار کا موقع کچھ زیادہ ہی ملا تو اس کے اندر کی عورت ایک بار پھر کسمسائی یعنی اس کا جی چاہا کہ کوئی بیٹی ہونی چاہئے۔ اس زمانہ میں دو یا تین بچوں کے بعد بس کرنے کا نعرہ لگایا جاتا تھا اس لئے اس نے تیسرے بچے کی تیاری شروع کر دی۔ پھر وہی اتفاق کہ تیسری اولاد لڑکی ہی ہوئی جس کا سونندہ کو بہت ارمان بھی تھا۔

جب تک ولاس شادی کر کے آئے۔ سونندہ نے بڑی ہوشیاری سے اس کے لئے مہربانیوں کا ایک اور ڈور تیار کر لیا تھا۔ دوباش سے اس نے کہا تھا کہ ولاس کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں اس لئے کچھ اجرت ہم لوگ بڑھا دیں گے اور کچھ اور بڑھانے کے لئے اس کے لئے کسی پارٹ ٹائم کا

انتظام کیا جائے۔ دوباش نے بہت سوچ وچار کر کے اس کے لئے ایک کام نکال رکھا تھا۔۔۔ شام کے اخبارات کی ہاکری کا۔

ولاس جب واپس آیا تواس کی خوب خاطر مدارت کی گئی۔ اسکی شادی اور بیوی کے بارے میں بالکل اپنوں کی طرح پوچھ تاچھ کی گئی اور قبل اس کے کہ خود کچھ کہے اس کی بہی خواہی میں کہا گیا کہ اب وہ گھر بار والا ہو گیا ہے اس لئے اسے اپنی آمدنی بڑھانے کی فکر کرنا چاہئے۔ کچھ ہم لوگ بھی ہاتھ بٹائیں گے اور کچھ اسے بھی کرنا ہوگا۔ سردست صاحب نے اس کے لئے ایک انتظام کیا ہے جسے وہ دوپہر بعد جب وہ خالی ہوتا ہے انجام دے سکتا ہے۔

ولاس نے شام کے اخبارات بیچنے کا کام شروع کر دیا۔ اپنی نوکری اور پارٹ ٹائم جاب سے جتنی رقم بھی بچتی وہ پابندی سے اپنے گھر بھیجتا۔ اس طرح اسکے دن مزے میں گزرنے لگے اور سوننده کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ حل بھی اس طرح ہوا کہ کئی سال گذر گئے یہاں تک کہ بڑے لڑکے نے ہائی اسکول پاس کر لیا اور دوسرا ابھی کچھ دنوں میں اسکول کی تعلیم کی آخری سیڑھی پر پہنچ جاتا۔ رہی لڑکی۔۔۔۔ تو وہ اب بے بی نہیں رہی تھی۔ وہ بھی اسکول جانے لگی تھی۔ سوننده لاکھ مدبر سہی مگر کوئی اتنا ماڈرن نہیں تھی کہ لڑکی کی تعلیم کیلئے اسے زیادہ سر کھپانا پڑتا۔ اپنی ہی طرح اسے بی اے۔ ایم اے کران تھا۔ لڑکوں کی بات اور تھی۔

سوننده کا فوری مسئلہ یہ تھا کہ ورون بارہویں پاس کرلے اور اسے انجینئرنگ میں داخل کرایا جائے۔ اس نے بارہویں پاس کیا اور اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ تب دوباش کو بھی حرکت میں آنا پڑا۔ سوننده نے اسے اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھنے دیا جب تک اس نے اپنے عہدے کے سارے رسوخ اور اثرات کو کام میں لاکر ورون کا انجینئرنگ میں ایڈمیشن نہیں کرا لیا۔

اور سب کام معمول کے مطابق چل رہے تھے۔ ولاس کو بھی جس ڈھرے پر لگایا گیا تھا اس پر لگا ہوا تھا۔ بس سال میں مہینے ڈیڑھ مہینے کے لئے اسے گھر جانے دیا جاتا تھا مگر اس وقت جب گرمیوں میں سوننده کے کالج میں بھی لمبی چھٹی ہوتی تھی۔ چھٹیاں گزار کر ولاس پھر اسی پنجرہ میں آجاتا تھا۔

لمبی تعطیل میں وہ سیر و تفریح کرنے نہیں جاتی تھی بلکہ بچوں کی پڑھائی لکھائی کا جائزہ لیا کرتی تھی اور وشال کو سمجھاتی تھی کہ پڑھائی میں خوب دل لگا کر اچھے نمبر سے پاس ہو تاکہ اس کے پپا اس کا داخلہ میڈیکل میں کرا سکیں۔ اپنے شوہر کے متعلق اسے یہ فکر ہو گئی تھی کہ ان کے ریٹائرمنٹ میں چند سال رہ گئے ہیں۔ ان کی عمر بھی بڑھ رہی ہے اس لئے قبل اس کے ان کا اثر رسوخ

بھی زائل ہو وشال کا میڈیکل میں ایڈ میشن ہو جانا چاہئے۔

کبھی کبھی ولاس کے متعلق بھی اسے تشویش ہونے لگتی تھی کیونکہ اور کسی چیز میں تو فرق نہیں آیا تھا مگر اس کے معمولات میں فرق آنے لگا تھا۔ اس کے آنے جانے میں دیر ہو جاتی تھی۔ کہاں تو وہ ٹی وی کے پروگرام کو مس نہیں کرتا تھا اور کہاں اب اس کی دھن اسے نہیں رہی تھی بلکہ اب وہ شام کے اخبارات صرف بیچتا ہی نہیں تھا بلکہ بغل میں دبائے دو ایک اخبار لانے بھی لگا تھا جسے وہ کچن میں کہیں رکھ کر کھانے پینے کا انتظام کرنے لگتا تھا۔

جب یہی اس کا معمول ہو گیا تو سونندہ بھی ٹوہ لینے لگی۔ وہ اس کے لائے ہوئے اخبارات کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ عوامی آواز اور جن مورچہ جیسے اخبارات ہوتے تھے جس میں دبے کچلے عوام کی خستہ حالی کا ذکر ہوتا تھا اور انہیں اپنا حق حاصل کرنے کے لئے اکسایا جاتا تھا۔ پولیٹیکل سائنس کی لکچرر ہونے کے ناطے سونندہ کو ملک کے سیاسی حالات کا اندازہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بائیں بازو کے اور سوشلسٹ خیالات کے سیاستداں اپنا ووٹ بنک بنانے کے لئے اسی قسم کی انقلابی باتیں کرتے ہیں۔ ووٹ حاصل کرنے کے لئے تو اب سبھی یہاں تک کہ بہوجن سیاستداں بھی بھولے بھالے عوام کو جھوٹے سپنے دکھاتے ہیں۔ چھوٹے پیانے پر اس نے بھی ولاس کو جھوٹی امیدوں پر ٹکا رکھا تھا۔ ولاس ٹکا ہوا ضرور تھا مگر معمولات کی طرح اس کے رنگ ڈھنگ بھی اب بدلنے لگے تھے۔ وہ بڑا گمبھیر رہنے لگا تھا۔ گمبھیرتا کی وجہ شاید یہ تھی کہ اب وہ صرف اخبارات ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ کتابوں کا مطالعہ بھی کرنے لگا تھا۔ یہ کتابیں زیادہ تر دلت سوانح ہوا کرتی تھیں۔ ان میں سے چند جیسے دیا پوار، لکشمن گائیکواڑ اور لکشمن مانے کی سوانح سونندہ نے بھی ولاس سے لے کر پڑھی تھیں۔ انسانی نقطہ نظر سے اسے تکلیف ہوتی تھی کہ باباصاحب امبیڈکر کو جو زندگی جینی پڑی تھی اور جس کے خلاف انہوں نے صدائے احتجاج بلند کیا تھا اس میں آزادی کے چالیس بیالیس سال بعد بھی کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ لیکن اسے اس بات کا اطمینان تھا کہ اس میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ اپنے طور پر اس نے پچھڑی ذات کے ایک فرد کو ہر طرح کا حق اور برابری دے رکھا ہے۔ ہر آدمی اگر ایسا ہی کرے تو بات بن جائے۔ مگر ہر شخص کو صدیوں پرانے سماجی نظام کو بدلنے کیلئے تیار کرنا بھی تو آسان نہیں.... تاہم بدلاؤ کی ہوا چلنے لگی تھی۔

- - - - -

مظلوم اور دلت عوام کے حقوق کی بات تو آئین میں بھی کی گئی تھی بلکہ انصاف دلانے کیلئے آئین میں ترمیم بھی کی گئی تھی، تحریکیں بھی چلائی جارہی تھیں اور کمیشن بھی بٹھائے گئے تھے

جس کا الیکشن کے موقع پر زیادہ زور و شور سے ذکر ہوتا تھا اور وقت گزر جانے پر پھر سناٹا چھا جاتا تھا۔

مگر اس بار جو وشال نے بھی اچھے نمبروں سے بارہویں کا امتحان پاس کر لیا تھا ایسا ہوا کہ اس سناٹے کو توڑنے کے لئے ایک صور پھونک دیا گیا جسے سن کر مردوں کی طرح سوئے لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ تبدیلی کی جو ہوا ہلکے ہلکے چل رہی تھی وہ طوفان میں بدل گئی۔

سوندھ کو لگا کہ اب کئی سال پہلے حق اور عزت کی جو لڑائی... ہتھیار بند لڑائی گاؤں میں لڑی جا رہی تھی وہ اب شہروں میں بھی چھڑ گئی ہے۔ شہر بھاگ کر آنے والے ولاس کا تیور بھی بدلا بدلا سا نظر آنے لگا ہے۔ دیر رات تک کچن میں لائٹ جلائے پتہ نہیں وہ کیا کرتا رہتا ہے۔

دوباش سے اس نے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا.... یہ ریزرویشن کا شوشہ چھوڑنے والوں نے ملک کو خانہ جنگی میں جھونک دیا ہے۔

"جو بھی ہو مجھے ولاس سے بھی ڈر لگنے لگا ہے۔"

"اس کے ساتھ کچھ اور نرمی اور مہربانی سے پیش آؤ۔"

سوندھ تو اس پر مہربان تھی ہی۔ اب کچھ اور اپنائیت دکھانے گی۔ حالانکہ اس ہنگامہ میں اس کا اپنا خواب بکھرتا نظر آ رہا تھا۔ میڈیکل میں وشال کا داخلہ ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان لوگوں کے پاس پیسے نہیں تھے کہ کسی پرائیویٹ کالج میں دکشنا دے کر ایڈمیشن کرا لے۔

ایڈمیشن تو خیر بعد کی بات تھی ریزرویشن کی حمایت اور مخالفت میں جو بلوے ہونے لگے تھے اس کی تفصیل سن اور پڑھ کر سوندھ کانپ اٹھتی تھی۔ وہ بار بار اٹھ کر کچن کی طرف دیکھتی اور پھر اپنے بچوں کے کمرے میں جا کر بیٹھ جاتی۔ ایک خیال آتا کہ باہر سے کچن بند کر دے مگر یہ مناسب نہیں لگتا تب وہ بچوں کے کمرے ہی کو باہر سے لاک کرنے لگی۔

ولاس کے دیر سویر آنے کی پرواہ کئے بغیر خود کچن میں چلی جاتی اور جب ماتھے پر بل ڈالے اور تیوریاں چڑھائے ولاس آتا تو اس کے ساتھ خوش مزاجی سے پیش آتی۔ بلکہ کیا سوگنی دیوی کی یاد ستا رہی ہے۔ گھر جانا چاہتے ہو وغیرہ کہہ کر اس کے تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کرتی۔

ولاس 'نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے' کہہ کر بات کو ٹالنا چاہتا تو سوندھ پھر دلت سوانح عمریوں کا ذکر کر کے اپنی کشادہ دلی کا مظاہرہ کرنے کے لئے یہ کہتی کہ..... ہم لوگ تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اپنے ہی دیش کے لوگوں کو اس طرح جینا پڑ رہا ہے۔ اصل میں اپنی طرف ایسا نہیں ہوتا نا۔

یہ سن کر ولاس صرف ہونٹ سکوڑ کر رہ جاتا تھا۔

گرچہ جو طوفان آیا تھا وہ تھم رہا تھا اور جو شعلے بھڑکے تھے وہ سرد ہو رہے تھے مگر سونندہ کو یا کسی بھی حساس شخص کو اس آگ میں بھسم ہونے والے حالات کی چرائند آج بھی محسوس ہو رہی تھی۔ سونندہ کو تو اور خاص کر کیوں کہ اس میں اس کا اپنا بہت پیارا خواب جھلسا جا رہا تھا۔ گرچہ تدبیر اور حوصلہ مندیوں کے مرہم لگا لگا کر اس خواب کو باقی رکھے ہوئے تھی۔

رات بے رات اس کی نیند اچاٹ ہو جاتی۔ وہ بچوں کے کمرے میں جھانکتی اور پھر کچن کی طرف بھی جہاں کبھی لائٹ جلتی ہوئی دکھتی اور کبھی نہیں۔ پھر بھی وہ دبے پاؤں کچن تک جا کر اندر جھانک لیا کرتی۔

ایک رات ایسا ہوا کہ کچن میں لائٹ دیکھ کر اس نے دروازہ کھٹکھنایا تو تھوڑے سے وقفہ کے بعد ولاس نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور حیرت سے سونندہ کو دیکھنے لگا۔ سونندہ اسے چھیڑنے کے لئے "سوگنی دیوی" کی یاد دلائی تو وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر رہ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی کتاب تھی۔ سونندہ نے اس کے بارے میں پوچھا تو ولاس نے کتاب اس کی طرف بڑھا دی۔ یہ بھی ایک سوانح عمری تھی ایک دلت مہیلا کمد پاوڑے کی۔ مرد دلتوں کی سوانح عمریاں تو اس نے پڑھی تھیں۔ کسی عورت کی کشمکش حیات سے واقفیت حاصل کرنے کا جذبہ ناقابل برداشت ہو گیا اور اس نے ولاس سے یہ کہہ کر کہ میں پہلے پڑھونگی، وہ کتاب لے کر چلی گئی۔

کمد پاوڑے مہار فرقہ کی عورت تھی مگر اس نے تعلیمی سطح پر ہونے والے تعصبات کا ذکر کیا تھا۔ اچھوت ہوتے ہوئے اس نے سنسکرت میں ایم اے کیا تھا۔ تعلیم کے دوران جو تلخ تجربات ہوئے تھے وہ تو الگ رہے ملازمت حاصل کرنے میں بھی کم پاپڑ نہیں بیلنے پڑے تھے۔ البتہ اونچی ذات کے کسی شخص سے اس کی شادی ہو گئی تو نوکری بھی اسے آسانی سے مل گئی۔ اس پر اس نے بڑا چبھتا ہوا ٹکڑہ لگایا کہ اسکے میکے کی ذات اب تک جن باتوں سے محروم ہے اسے وہ شرف اونچی ذات سے وابستہ ہونے کے بعد ملا ہے۔ شاید اس لئے کہ شادی کے بعد عورت کا بچپن کا نام ہی نہیں بدلتا اس کی ذات بھی بدل جاتی ہے۔

باوجود یہ کہ اس جملے میں بڑی کاٹ تھی مگر سونندہ کو یہ پڑھ کر کچھ اور ہی سوجھ گیا۔ یعنی ایک خیال.... بہت ہی انوکھا اور لاجواب خیال اس کے ذہن میں کوند گیا جس سے اس کے مستقبل کے منصوبے بھی جگمگا اٹھے۔

رات کے وقت دوباش سے بالکل چپک کر سونندہ نے جب اپنا منصوبہ بیان کیا تو دوباش کو جو ابھی تک سونندہ کی وجہ سے سہا ہی کرتا تھا آج ایک جھٹکا سا لگا۔ بہت زوردار جھٹکا بالکل زلزلے جیسا جھٹکا۔

سونندہ کی بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ بے جان پڑا نت نئے اندیشوں میں گھرا جا رہا تھا۔ مگر سونندہ کو اپنی ہی پڑی تھی۔ یہ سوچے بغیر کہ ابھی جو منصوبہ اس نے بنایا ہے وہ کس قدر خطرناک ہے اور دوباش پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ وہ کہنے لگی..... میں نے ساری معلومات حاصل کرلی ہے۔ ایک وکیل کو بھی تیار کرلیا ہے۔ ولاس سے کورٹ میں حلفیہ بیان دلوانے کی دیر ہے۔''

دوباش نے ہلکی آواز میں جیسے کہیں بہت دور سے بول رہا ہو پوچھا۔

''ولاس سے بھی پوچھا ہے۔ وہ کیا کہتا ہے؟''

ابھی پوچھا نہیں مگر اسے تیار کرنا کیا مشکل ہے۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔

دوسرے دن سونندہ صبح سویرے کچن میں جا پہنچی۔ اس کا یہ معمول نہیں تھا اس لئے ولاس کو کچھ حیرت ہوئی۔ اس کے مزاج میں جو سنجیدگی آچلی تھی اس میں اور کچھ اضافہ ہو گیا۔

سونندہ نے بڑے لاڈ سے پوچھا۔

کیا بات ہے ولاس آج کل اتنے کھوئے کھوئے سے کیوں رہتے ہو۔ سوگی دیوی کی یاد ستا رہی ہے کیا؟ سوگی کا ذکر سن سن کر ویسے بھی ولاس کا چت چنچل ہو رہا تھا اور اس وقت سونندہ نے پیار جتانے کے لئے جو اس کا ہاتھ تھام لیا تو وہ بالکل ہی جھنجھنا اٹھا لیکن خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے بڑے قاعدے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

تب سونندہ نے کہا۔

''ولاس تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

''کہیئے نا''

''ابھی نہیں..... شام کو کروں گی..... آج ذرا جلدی آجانا''

رات کے کھانے کے بعد جب سب اپنی اپنی جگہ سونے چلے گئے تب سونندہ نے دوباش سے کہا۔

''آپ سوئیے..... میں ذرا ولاس سے نپٹ لوں''

دوباش کو خیر نیند کیا آتی۔ سونندہ نے جو بات کہی تھی اسے سننے کے بعد اس کا چین سکون چھن گیا تھا۔ وہ جس بستر پر سویا کرتا وہ آج کانٹوں بھرا بستر ہو گیا تھا جس پر وہ کروٹیں بدل رہا تھا۔

سونندہ کو ولاس سے دو باتیں کرنی تھیں لیکن اتنی دیر کیوں ہو گئی۔ اس نے اندھیرے میں اٹھ کر کچن کی طرف دیکھا تو سکتے میں آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ سونندہ بڑی بے تکلفی سے ولاس کے ہونٹ اپنی چٹکی میں دبائے اسے بلا رہی ہے۔ دوباش اپنی بیوی کی سمجھداری کا تو قائل تھا مگر اس کی لگاوٹ کا نظارہ دیکھ کر وہ سوچنے لگا کہ .... سمجھدار نہیں .... سونندہ ایک چتر عورت ہے... بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔

اپنی ہی عورت کی چتورائی کو دیکھ کر وہ نڈھال سا ہو کر بستر پر گر پڑا۔

دوباش کی اپنی عورت اپنا مقصد حاصل کرنے، اپنے منصوبے کو کامیاب بنانے اور اپنے خواب کی تعبیر ڈھونڈنے کے لئے ہر حربہ استعمال کر رہی تھی۔ ولاس کو ہموار کرنے کے لئے اس نے چھل، چتورائی اور چوکسی کا جال بچھا دیا تھا۔ وہ اس پر احسان بھی جتا رہی تھی اور گڑگڑا بھی رہی تھی۔

ولاس سے اس نے کہا کہ اٹھارہ بیس سال کے عرصہ میں وہ اس گھر کے ایک فرد کی طرح رہا ہے۔ اسے کوئی غیر نہیں سمجھا گیا۔ بچے بھی اسکے گرویدہ رہے ہیں۔ سچ پوچھا جائے تو ان بچوں کی پرورش بھی اسی نے کی ہے۔ اس نے ان بچوں کے مستقبل کا جو خاکہ تیار کیا ہے اس کو پورا کرنے کے لئے اس نے ہر طرح کی قربانی دی ہے۔ ورون تو خیر انجینئر بن جائے گا مگر وشال کو اس نے ڈاکٹر بنانے کا سپنا دیکھا ہے۔ اس کے صاحب چند برسوں میں ریٹائر ہو جائیں گے۔ اس سے پہلے دونوں بچوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جانا چاہیے۔

مگر حالات بدل رہے ہیں اور بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں۔ گرچہ وشال نے بہت اچھے نمبروں سے بارہویں پاس کیا ہے مگر اب نہ اس کے پاپا کا رسوخ کام کرے گا اور نہ اس کی اپنی صلاحیت۔ تھیلی بھر روپے دے کر ایڈمیشن کرانے کی اس کی سکت نہیں۔ ریزرویشن کی وجہ سے سارے راستے بند ہو گئے ہیں۔ اس دھرم سنکٹ سے انہیں اگر کوئی نکال سکتا ہے تو صرف ولاس۔

ولاس کو اس پر حیرت ہوئی تو سونندہ نے اٹھلاتے ہوئے اس کے سامنے اپنا منصوبہ رکھا۔ ولاس کو جیسے بجلی کا جھٹکا لگا تو اسے سنبھالنے کے لئے سونندہ نے کہا کہ اس نے وکیل سے حلفیہ بیان تیار کروا لیا ہے۔ کل عدالت میں چل کر ولاس کو اس بیان سے اتفاق کر کے دستخط کرنے ہیں۔ بس۔

سونندہ کیلئے یہ بات چاہے جتنی آسان رہی ہو دوباش کے لئے یہ آسان تھی اور نہ ولاس کے حلق سے نیچے اتر رہی تھی۔ دوباش اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا اور ولاس کچن میں کسی قیدی کی

طرح تڑپ رہا تھا۔ ممکن ہے وہ راتوں رات فرار ہو جاتا مگر سونندہ نے جو ساری رات جگی کبھی دوباش کو دیکھتی اور کبھی اپنے بچوں کو، کچن کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔

اگلی صبح ویسی ہی ہوئی جیسی اور دن ہوا کرتی تھی مگر سونندہ اور اس کے خاندان کے افراد کے لئے جن میں ولاس بھی تھا۔ یہ بڑی عجیب صبح تھی۔ سب ناشتہ بھی کر رہے تھے۔ معمول کے مطابق اپنے اپنے کام پر جانے کی تیاری بھی کر رہے تھے۔ لیکن پھر بھی اور دنوں والی بات نہیں تھی۔ دوباش اندر ہی اندر ٹوٹا ہوا، سونندہ خوابوں کی دنیا میں سفر کرتی ہوئی اور ولاس گہری فکر میں ڈوبا ہوا۔

ولاس سے حلفیہ بیان دلوانے کے لئے سونندہ اپنے پتی کی کار میں اس طرح چلی کہ دوباش کے پہلو میں وہ خود بیٹھی اور ولاس کو اور دنوں کی طرح ڈرائیور کے پاس نہیں بلکہ اپنے بازو میں بٹھایا۔ دو مردوں کو ایک ساتھ لے کر چلنے والی سونندہ کو یہ خطرہ تھا کہ کہیں ولاس بھاگ کھڑا نہ ہو۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ ولاس چاہے رات کو نہیں بھاگ سکا مگر وہ طے کر چکا ہے کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔

عدالت میں جب ولاس کو اس کا حلفیہ بیان جو سونندہ نے بڑی ہوشیاری سے تیار کروایا تھا، پڑھ کر سنایا گیا تو اس نے اس میں درج ہر بات سے انکار کر دیا۔ سونندہ کا تو جیسے سارا خواب چکنا چور ہو گیا۔

باہر آکر ولاس سے سونندہ نے جو فریادی انداز میں پوچھا کہ یہ کیا کیا تو اس نے بڑے رسان سے جواب دیا کہ مالکن میں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ آپ کا سیوک ہوں۔ اپنے طور پر میں کچھ بھی کر سکتا ہوں، اپنی جان بھی دے سکتا ہوں مگر دوسرے کا حق نہیں مار سکتا۔ صدیوں سے دبائی کچلی جانے والی پچھڑی جاتیوں کا حق دینے کا خیال اب سرکار کو آیا ہے تو عدالت کی کارروائیوں یا وکیلوں کی چالاکیوں سے اسمیں ہیر پھیر تھوڑے ہی نہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جات (ذات) تو جنم کے ساتھ آتی ہے اور مرنے پر بھی نہیں جاتی ہے ۔

ولاس کی یہ فلسفیانہ بات سن کر سونندہ تیورا کر گرتی بچی۔

پر یہ بات عدالت کے کمرے سے نکل کر کورٹ میں اور پھر پورے شہر میں اور اخبارات کے ذریعہ ہر جگہ پھیل گئی کہ کس طرح اعلیٰ ذات اور اونچے مرتبہ کی ایک بیاہتا عورت نے پچھڑی ذات سے تعلق رکھنے والے اپنے ملازم کو اپنے ایک بچے کا باپ ثابت کرنے کے لئے عدالت میں جھوٹا حلفیہ بیان دلوا کر سرکار کی پالیسی کی ایسی تیسی کرنے کی کوشش کی۔

اس کے ساتھ ہی پورے دیش میں ریزرویشن کی موافقت اور مخالفت میں ایک تیز اور تیکھی بحث چھڑ گئی۔

انجام کار

اس کے لئے یہ رات بڑی کٹھن تھی۔

کچن کے فرش پر بستر لگا ہوا تھا۔ ہر دن اس بستر پر اسے میٹھی اور گہری نیند آجاتی تھی جہاں سے منہ اندھیرے وہ اٹھ پڑتا تھا اور کام میں جو جتا تھا تو پھر رات کو ہی پیٹھ لگانے کا موقع ملتا تھا۔ دن بھر کی تھکن اسے فوراً ہی نیند کی آغوش میں پہنچا دیتی تھی۔

مگر آج کی رات بڑی کٹھن تھی۔

ہر چند وہ معمول کے مطابق سارا دن پھرکی کی طرح گھومتا رہا تھا لیکن نیند کا آج دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ دل جب اداس اور دماغ بے چین ہو تو نیند آئے بھی تو کیونکر آئے۔ آج جو کچھ اس نے اپنے مالک سے سنا تھا اس سے اسے بڑا صدمہ پہنچا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی خدمت اور خلوص کی کوئی قدر نہیں ہے۔ بس یہ لوگ اپنا کام نکالنے کے لئے اسے بے وقوف بناتے رہے ہیں۔ اور وہ بھی ایسا سیدھا اور ناداں کہ ان لوگوں کی چکنی چپڑی باتوں کو صحیح مانتا رہا۔ مالک کا کھانا لے کر جب وہ عالیشان سی عمارت میں ان کے دفتر جاتا تھا تو لال جھنڈے لگائے دھرنا دینے اور احتجاج کرنے والے جو لوگ لان میں پڑے رہتے تھے وہ جو سمجھاتے تھے اسی میں سچائی تھی۔۔۔ مگر ان لوگوں کی باتوں میں وہ کبھی نہیں آیا۔ سیدھے سجاؤ اپنے کام میں لگا رہا۔ جس پر اپنے حق کے لئے دھرنا دینے والے لوگ اسے بے وقوف سمجھتے تھے۔ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس کے نام کو بگاڑ کر کہا کرتے تھے کہ "دھرو نہیں۔۔۔ دتھورا ہے۔۔۔ دتھورا۔۔۔ بالکل دتھوروا۔۔"

دور دراز گاؤں کا رہنے والا دھرو چند۔۔۔ ذات کا کہار۔۔۔ لیکن اس کے پیدا ہوتے ہوتے ہی کہاروں کے آبائی پیشہ یعنی ڈولی اور پالکی ڈھونے کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ سستی اور تیز رفتار سواریوں کے آجانے پر ایسا ہوا تھا یا برادری کے فیصلے پر کہ اب کہار انسانوں کو ڈھونے یعنی جانوروں کی طرح محنت کرنے کا پیشہ نہیں کریں گے وجہ جو بھی ہو۔۔۔ کہاروں کا آبائی پیشہ ختم ہو چکا تھا مگر اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ محنت و مشقت سے بھی چھٹکارا مل گیا تھا۔۔۔ نہیں۔ زندہ رہنے کے لئے انہیں محنت مشقت کرنی ہی پڑتی تھی۔ جانوروں کی طرح بڑے لوگوں کی خدمت کرنی ہی پڑتی تھی۔ چوکیداری کی سرکاری نوکری تو دو ایک کو ہی ملتی تھی۔ باقی لوگوں کو زمینداروں کے کھیتوں میں،

ڈسٹرکٹ بورڈ کی سڑکوں پر مٹی ڈالنے یا سرکاری اسکیم کے تحت نہروں کی کھدائی اور بندھ اور پشتوں کی تعمیر میں خون پسینہ ایک کرنا ہی پڑتا تھا۔

آدمیوں کا بوجھ ڈھونے کے پیشے سے ہاتھ کھینچ لینے والے کہاروں میں سے ایک ایسے ہی کہار کے گھر میں دھروچند کی پیدائش ہوئی تھی۔۔۔ جانوروں کی طرح محنت کرنے والے کہار کے گھر جنم لینے والا دھروچند نہ صرف ناک نقشہ کا اچھا تھا بلکہ ذہن کا بھی اچھا تھا اس لئے گاؤں کے میڈل اسکول میں پڑھنے لگا۔ ذہانت کے علاوہ تابعداری بھی اسے ورثہ میں ملی تھی اس لئے اپنے استادوں کی، ماں باپ کے مالکوں کی، حد تو یہ ہے کہ اپنے سے اونچے کلاس والوں کی بلکہ خود اپنے ان ہم جماعتوں کی بھی جو اونچی ذات کے تھے، وہ تابعداری کیا کرتا تھا۔ اس تابعداری اور فرمانبرداری کا پھل اسے یہ ملا کہ مڈل تک پڑھ ہی گیا۔

لیکن مڈل کے بعد آگے پڑھنے کا کوئی راستہ نہ رہا۔ ہائی اسکول تھا جہاں تک روزانہ آنا جانا ممکن نہیں تھا۔ باوجودیکہ بسیں چلنے لگی تھیں مگر دھروچند کا باپ بس کا روزانہ کرایہ یا اسکول کے قریب کہیں اس کی رہائش یا پرانی ہی سہی ایک سائیکل خریدنے کا بوجھ اٹھانے سے معذور تھا اس لئے اور پڑھنے کے لئے دھروچند کا راستہ بند ہو گیا۔

تب ہی ایسا ہوا کہ گاؤں کے ایک بڑے کسان کے گھر کا دروازہ اس کے لئے کھلا تو اس نے سمجھا کہ جیسے اس کی قسمت کھل گئی۔ اس کسان کے لڑکے لڑکیاں شادی بیاہ کے بعد یا نوکری ملازمت کے سلسلے میں شہروں میں رہا کرتے تھے۔ یہاں گاؤں میں روزگار کی کوئی ایسی صورت نہیں تھی کہ مڈل پاس دھروچند کی کھپت ہوتی۔ اتنا پڑھنے کے بعد اپنے عزیزوں کی طرح جانوروں جیسی مشقت کرنے سے تو وہ رہا۔ دوسرے بھی اس کا تقاضہ نہیں کر سکتے تھے۔ مگر ماں باپ کا ہاتھ بٹانے کے لئے نہ سہی اپنی گزر بسر کے لئے تو اسے کچھ کرنا ہی چاہئے تھا۔ سو روزگار کی تلاش میں۔ تلاش میں کیا نوکری پا کر کسان کی ایک شادی شدہ لڑکی کے ہمراہ جس کے شوہر ریلوے کے بڑے آفیسر تھے، وہ شہر چلا آیا۔ اسے چلا بھی جانا چاہئے تھا کہ زمیندار کی لڑکی نے خود دھروچند کو یا اس کے گھر والوں کو اطمینان دلانے کے لئے کچھ ایسی باتیں کی تھیں جن کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ ان لوگوں کے یہاں کام کرتے کرتے دھرو کو ریلوے میں پکی نوکری بھی دلائی جا سکتی ہے جس کے بعد اسے اچھی تنخواہ اور اوور ٹائم اور بونس کے علاوہ مفت آنے جانے کے لئے ریلوے پاس بھی مل سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس کے شوہر کی کوششوں سے اسے کوارٹر بھی مل جائے جہاں دھروچند اپنے بیوی بچوں اور ماں باپ کے ساتھ رہنے لگے۔ یہی وجہ تھی کہ دھروچند کو ایسا لگا تھا جیسے اس کی قسمت کھل گئی۔

زمیندار کی لڑکی، اس کے شوہر اور ان لوگوں کے تینوں بچوں سے دھروچند یقیناً واقف تھا لیکن ان لوگوں کی اسے کیا خدمات انجام دینی تھیں اس کا اندازہ اسے شہر آنے سے پہلے نہیں تھا۔ ان کے ساتھ اتنا لمبا سفر کرنے اور پُر رونق شہر پہنچنے کے بعد اسے جتنی خوشی ہوئی تھی اس سے کہیں زیادہ خوشی اسے ان لوگوں کے کوارٹر پہنچنے پر ہوئی۔ ایک بڑا سا بنگلہ چم چماتے دروازوں اور شیشوں سے آراستہ۔ بنگلہ کے اندر طرح طرح کے سامان آرائش، ٹی وی، ویڈیو، ٹیلی فون۔۔۔ باہر ایک خوبصورت اور کشادہ لان جو اس کے آنے سے پہلے پھولوں پودوں سے محروم تھا۔ وہیں پر ایک خالی پڑا ہوا کمرہ جسے گیرج کہا جاتا تھا۔ دھروچند نے سوچا تھا کہ اسے ہی وہ اپنا کوارٹر بنالے گا اور دھیرے دھیرے ماں باپ کو بھی بلالے گا مگر زمیندار کی لڑکی کے شوہر نے جنہیں اسے صاحب کہنا پڑتا تھا منع کردیا تھا کہ یہ شہر اچھا نہیں۔۔۔ تمہارا اکیلے باہر رہنا مناسب نہیں۔ تم بنگلے کے اندر ہی رہا کروگے۔ زمیندار کی لڑکی نے جو میم صاحب کہلاتی تھیں اس کی رہائش کا انتظام کچن میں کردیا تھا۔ اسی کچن میں وہ آج رات بے چین بیٹھا تھا اور اسے یہ سارے قصے یاد آرہے تھے۔

نئی جگہ، نیا ماحول اور نئے طور طریقے۔ دھروچند کو جو ذہین تھا ایڈجسٹ کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ چند ہی دنوں میں اس نے سب کچھ سمجھ لیا اور سارا کام اس طرح کرنے لگا جیسے اسے ہر کام میں راحت اور سکون ملتا ہو۔

دھروچند کو کچن اس طرح سونپا گیا کہ وہی اس کے کام کی جگہ بھی بنا اور آرام کی جگہ بھی۔ ابھی سب لوگ سوئے پڑے ہی ہوتے تھے کہ وہ اٹھ بیٹھتا۔ جھٹ پٹ دودھ لاتا۔ پاؤ انڈے لاتا اور پھر دونوں بابا کو ان کے کمرے میں جاکر جہاں وہ پڑھتے بھی تھے اور سوتے بھی، گدگدا کر جگاتا۔ ان کے منہ ہاتھ دھلاتا اور پھر ناشتہ کراتا۔ ابھی یہ دونوں اونیندی حالت میں، دھروچند کی چمکار کے ساتھ ناشتہ ہی کرتے ہوتے کہ میم صاحب بھی جو دوسرے کمرے میں صاحب اور منی کے ساتھ سویا کرتی تھیں انگڑائیاں لیتی ہوئی باہر آجاتیں۔ دھروچند بیڈ ٹی تیار کرکے صاحب کے کمرے میں پہنچا آتا۔ ان کے شیو کا سامان اور گرم پانی بھی رکھ آتا اور پھر دونوں بابا کے بستوں کو اٹھائے اور ان کی انگلی تھامے سڑک پر اس جگہ پہنچ جاتا جہاں اسکول بس آیا کرتی تھی، ان دونوں کو بس پر سوار کرا اور ٹاٹا کہتے ہوئے وہ الٹے پاؤں بنگلے پر آتا۔ تب تک صاحب باتھ روم میں ہوتے یا باتھ روم سے نکل چکے ہوتے تھے اس لئے اب ان لوگوں کے ناشتہ کا انتظام کرتا۔ صاحب چائے پیتے اخبار پڑھتے اور میم صاحب ان کے کپڑے نکالتیں۔ دھروچند صاحب کے اور بابا لوگ کے کپڑوں پر آئرن کرتا۔ چھوٹے بڑے سبھوں کے بوٹ پر پالش کرنا بھی اسی کی ڈیوٹی تھی۔

چائے ناشتہ سے فارغ ہو کر جب سب اپنے اپنے کام سے لگ جاتے، تب دھر وچند بچی روٹی اور بھاجی کھانے بیٹھتا۔ شروع شروع میں چائے کی تو اسے عادت نہیں تھی لیکن ان لوگوں کے ساتھ رہتے رہتے اب وہ چائے بھی پینے لگا تھا بلکہ سچ پوچھا جائے تو میم صاحب ہی نے اسے یہ کہہ کہہ کر چائے پلانا شروع کر دیا تھا کہ یہاں کی آب و ہوا میں رہنے والوں کو چائے ضرور پینا چاہئے۔ چائے کے علاوہ دھر وچند اخبار پر بھی ایک نظر ڈالتا۔ اس گھر میں طرح طرح کے اخبارات اور رسالے آتے تھے جسے دھر وچند فرصت کے اوقات میں پڑھتا تھا۔ یہاں تک کہ میم صاحب کے پسندیدہ رسالے بھی جن میں عورتوں کی مجبوری اور ان کی آزادی کی جدوجہد کے باتصویر قصے ہوتے تھے۔ بعضوں میں عام جنتا۔۔۔ جنتا یعنی غریب غرباء کے جس طبقے سے دھر وچند کا بھی تعلق تھا، اس طبقے کی پریشانیوں کے لرزہ خیز قصے اور خبریں ہوتی تھیں۔

لیکن ایسا فرصت کے اوقات ہی میں ہوتا تھا یعنی جب لوگ آرام کرتے یا سونے سلانے کی تیاری کرتے تھے تب دھر وچند دل بہلانے کے خیال سے رسالے پڑھتا تھا۔ ٹی وی وغیرہ کے اچھے پروگرام کے وقت اسے کھانا تیار کرنا پڑتا تھا اس لئے یہ سارے پروگرام نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح چائے ناشتے کے وقت وہ زیادہ دیر تک اخبار نہیں پڑھا کرتا تھا۔ چاہنے کے باوجود نہیں پڑھ سکتا تھا کہ دن کا کھانا تیار کرنا اس کی ذمہ داری تھی۔ اور صرف تیار کرنا نہیں بلکہ صاحب کا لنچ لے کر بھی وہی جاتا تھا۔ چمکتے ہوئے اسٹین لیس اسٹیل کے ٹفن دان میں لنچ اور تولیہ میں پانی کی بوتل ڈھکے ہوئے جب وہ اس عالیشان عمارت میں پہنچتا تھا تو اس کا دل باغ باغ ہو جاتا تھا۔ خاص کر صاحب کے آفس پہنچنے پر جہاں داخل ہوتے ہی ایر کنڈیشن کی ٹھنڈی ہوا اس کا استقبال کرتی تھی۔ مگر وہ زیادہ دیر تک اس ہوا سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا تھا۔ بیک روم میں ٹفن کیریئر، پانی کی بوتل اور پلیٹ چمچ رکھ کر وہ چپ چاپ باہر نکل آتا تھا۔ صاحب کے کھانے تک اسے باہر انتظار کرنا پڑتا تھا۔

اس اثناء میں وہ صاحب کے اپنے پیون یا دفتر کے دوسرے چپراسیوں کے ساتھ اودھر ادھر کی باتیں کیا کرتا۔ ان باتوں کے دوران کوئی چپراسی اسے سمجھاتا کہ تم اپنی میم صاحب سے کہہ کر خود کو ریگولر کروا لو تو کافی فائدے میں رہو گے۔ گپ شپ کے لئے کوئی چپراسی نہیں ملتا تو وہ اس کھلے حصے میں آجاتا تھا جہاں لمبے پیڑوں کی ٹھنڈی چھاؤں اور سبز گھانس کا فرش ہوتا تھا۔ اس جگہ آئے دن دھرنا دینے والے پڑے ہوتے تھے۔ دھر وچند ان سے کوئی بات نہیں کرتا کہ ان کے پوسٹروں پر جو نعرے لکھے ہوتے اس میں پرمننٹ کرنے، بھتہ بڑھانے اور دوسری مانگوں کے علاوہ ان کے اپنے صاحب یا ان کے ساتھیوں کی شان میں گستاخیاں بھی لکھی ہوتی تھیں۔ پورا ماجرانہ تو

اس کی سمجھ میں آتا تھا اور نہ اس نے کبھی سمجھنے کی کوشش کی مگر پھر بھی ان کے احتجاج کا طریقہ اسے کبھی دلچسپ اور کبھی مضحکہ خیز لگتا تھا۔ یہ مضحکہ خیز لوگ اگر اسے کبھی اپنے پاس بلاتے تو دھروچند ایک لمحہ ضائع کئے بغیر وہاں سے کھسک کر صاحب کے کیبن کے پاس چلا جاتا تھا جہاں اسے حفاظت کا احساس ہوتا تھا۔ یا پھر صاحب لنچ لے چکے ہوتے تو برتن سمیت کر بگٹٹ بنگلے کا راستہ لیتا۔

یہاں جب تک بابا لوگ آ چکے ہوتے تھے اور میم صاحب ان لوگوں کو کھلا پلا کر خود بھی کھا چکی ہوتیں یا کھانے کو جا رہی ہوتیں۔ تب دھروچند بھی بچی کھچی چیزوں کو جو اس کی ہی بنائی ہوئی ہوتیں مزے لے لے کر کھاتا اور میم صاحب اور بچوں کو کتا جھپکی لینے دیتا اور خود گندے کپڑے سمیٹ کر دھونے بیٹھ جاتا۔ ان کپڑوں میں اس کے اپنے کپڑے بھی ہوتے تھے۔ اپنے اس لئے کہ اب وہی استعمال کرتا تھا لیکن ہوتے تھے صاحب ہی کے۔ جو گھس پٹ جانے پر بے کار پڑے ہوئے تھے اور میم صاحب نے کتر بیونت کر اس کے مطابق بنا دئے تھے۔ کپڑا ہی نہیں اس کے پاس جو جوتا تھا وہ بھی صاحب ہی کا استعمال شدہ تھا جس پر دوسروں کے جوتوں پر پالش کرتے وقت ایک آدھ ہاتھ مار دیتا تھا۔ ممکن ہے اس کے اس شوق بے جا پر اعتراض کیا جاتا اور کیا پتہ کہ ہوا بھی ہو کہ صاحب کو اس نے یہ کہتے سنا تھا کہ

"اچھا ہے۔۔۔ نوکروں کا صاف ستھرا ہونا اچھا ہے۔"

نوکر۔ نوکر کا لفظ سننے سے پہلے دھروچند نے ان لوگوں کے ساتھ اپنا رشتہ متعین نہیں کیا تھا۔ اس سلسلے میں کچھ سوچا بھی نہیں تھا۔ مانا کہ گاؤں میں ذات پات اور امیری غریبی کا فرق تھا مگر یہاں اس خوبصورت شہر میں تو یہ ان کے گھر میں رہتا تھا۔ ان کے برتن میں کھاتا تھا اور ان کو اپنا ہی سگا سمبندھی مانتا تھا تب تو نوکروں کی طرح اس نے کبھی یہ کریں گے اور یہ نہ کریں گے کے متعلق سوچا تک نہیں۔ ان کے ہر کام انجام دینے میں اسے یک گونہ خوشی ہوتی تھی۔ صرف یہ ہی کیوں، ان کے ملنے جلنے والوں کی خدمت کر کے بھی وہ خوشی محسوس کرتا تھا۔ گھر میں جب میم صاحب کی سہیلیاں آتی تھیں تو اس سے ہنس ہنس کر بات کرتی تھیں۔ اپنے یہاں کتنے دن سے نہ آنے کی شکایت کرتی تھیں تو دھروچند کا انگ انگ کھل اٹھتا تھا۔ ان کے یہاں جانے یا بہت دن سے نہیں جانے کا جہاں تک تعلق ہے تو کتا جھپکی لینے کے بعد تو میم صاحب روز کسی نہ کسی کے یہاں جایا کرتی تھیں۔ کباڑ اور اپنے بیڈ روم کو لاک کر کے سارا گھر دھروچند پر چھوڑ کر بے فکر چلی جاتی تھیں کہ نہیں۔ بس جاتے جاتے یہ تاکید کر جاتی تھیں کہ کوئی گھنٹی بجائے تو فوراً دروازہ مت کھولنا۔ اب دھرو کو خود بھی اندازہ ہو گیا تھا اس لئے ڈور بیل کی آواز سن کر پہلے وہ اسپائی ہول سے تاکتا تھا یا بہت

ہوا تو لپک لگا کر دروازہ کھولتا تھا۔ میم صاحب کی سکھی سہیلیوں کے یہاں جہاں تک اس کے جانے کی بات ہے تو فون جب کام نہیں کرتا تھا تو ان کی چٹھی لے کر یا کوئی خاص ڈش لے کر جاتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ ان کے یہاں جانے میں اسے بھی مسرت ہوتی تھی اس لئے نہیں کہ سیر سپاٹے کا موقع مل جاتا تھا بلکہ اس لئے کہ وہ لوگ دھرو چند کا بڑی محبت سے سواگت کیا کرتی تھیں۔ حال چال پوچھا کرتی تھیں۔

لیکن صاحب کی زبانی نوکر کا لفظ سن کر اسے اپنی صحیح اوقات معلوم ہوئی اور تب ہی اسے یہ خیال بھی آیا کہ وہ کیسا نوکر ہے۔ آخر بچے کھچے کھانے اور اترن کپڑے پر گزر بسر کر رہا ہے اور اپنی محنت کا کوئی معاوضہ نہیں پاتا۔ حالانکہ گاؤں میں اس کے ماں باپ بڑی اذیت ناک زندگی گزار رہے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ یہاں آ کر وہ ان لوگوں کو بالکل بھلا بیٹھا اور نوکر ہوتے ہوئے بھی ان لوگوں کی کوئی خدمت نہیں کرتا۔ خدمت کر رہا ہے تو ان لوگوں کی جو اس کے خلوص کی قدر نہیں کرتے۔ اس نے کبھی ان کو پرایا نہیں مانا۔ اس لئے نہ حرف شکایت زبان پر لایا اور نہ سودا سلف لاتے وقت جو اس کا روز سہ پہر کا معمول تھا، ایک پیسے کی بے ایمانی کی جبکہ دوسرے نوکر تو مارکیٹنگ کے وقت چائے پانی کے لئے کچھ نہ کچھ بچا ہی لیتے ہیں۔

خیر۔۔۔ تو موقع نکال کر اس نے ایک دن میم صاحب کو مخاطب کر کے، جب کہ صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے، ہاتھ ملتے ہوئے اور بڑی لجاجت سے کہہ ہی دیا کہ اسے ان لوگوں کے ہاں نوکری کرتے کئی مہینے ہو گئے لیکن آج تک اس کی تنخواہ طے نہیں ہوئی۔ یہ کہتے وقت اگرچہ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور چہرہ اترا ہوا تھا۔ مگر پھر بھی صاحب سکتے میں آ گئے۔ انہیں لگا جیسے کوئی مصیبت ٹوٹنے والی ہے اور اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ دکشنا دینا ضروری ہے۔ تو بطور دکشنا انہوں نے ایک منٹ بھی ضائع کئے بغیر کہا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ تمہیں بنگلہ پیون کے طور پر لگوا رہا ہوں۔ تمہیں تنخواہ بھی ملے گی۔ ایک ذرا صبر کرو۔"

دھرو چند کہنے کو تو تنخواہ کی بات کہہ گیا تھا لیکن کہنے کے وقت سے لے کر اب تک اس پر ایک عجیب سی شرمندگی طاری تھی۔ بنگلہ پیون کی باتنخواہ ملازمت پانے کی خوشخبری سن کر بھی اس کی ندامت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ تب وہ اور جوش و خروش سے اپنے مہربانوں کی خدمت میں لگ گیا۔ مثلاً ایک دن بازار سے گزرتے ہوئے اس نے کسی ہوٹل کے باورچی کو بہت اونچی سی ٹوپی لگا کر کام کرتے دیکھا تو اس نے بھی لہردار گتے کو تراش خراش کر ایک اونچی سی ٹوپی بنالی جسے کھانا پکاتے

وقت وہ ضرور پہنتا۔ اس کے ذوق و شوق کو دیکھ کر اس کے مالکوں کو بھی یک گونہ اطمینان ہوا۔

اور دھرو چند جب واقعی بنگلہ پیون ہو گیا تو اس نے نہ تو یہ پوچھا کہ یہ نوکری کیسی اور کیا ہے اور نہ ہی تنخواہ کے بارے میں سوال کیا۔ ہاں جب میم صاحب نے خود اس سے پوچھا کہ تنخواہ کا کیا کرو گے تو ایک ذرا رک کر اس نے ڈرتے ڈرتے صرف اتنا کہا۔

''گاؤں بھیج دی جائے۔ ماں باپ کو۔''

اس کے بعد اسے اور قلبی سکون اور ذہنی اطمینان ہو گیا۔ گاہے بگاہے وہ اپنے بارے میں ماں باپ کو خط لکھتا ہی رہتا تھا۔ اب اور زیادہ۔۔۔ پابندی سے لکھنے لگا۔ اور گھما پھرا کر پوچھ بھی لیتا تھا کہ انہیں پیسے مل تو رہے ہیں اور وہ کس طرح خرچ ہو رہے ہیں۔ ادھر سے چوں کہ باپ ماں کا کوئی خط نہیں آتا تھا بلکہ میم صاحب کے والد کا جو خط آتا تھا اسی میں ان لوگوں کی خیریت اور روپے کے ملنے کی بات ہوتی تھی اس لئے اور کچھ پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں رہ جاتی تھی۔

لیکن اب جب وہ بنگلہ پیون ہو گیا تو صاحب کے چپراسی یا ان کے اتنے بڑے آفس کے دوسرے چپراسی اسے یہ سمجھاتے کہ صاحب سے کہہ کر تم پرمننٹ نوکری میں آجاؤ تو کئی فائدے پہنچیں گے۔ تنخواہ بھی زیادہ ملے گی اور وطن جانے کے لئے پاس پی ٹی او کے حقدار بھی ہو جاؤ گے۔

ابھی دھرو چند جو کچھ تھا پرمننٹ ہونے کے بعد اس کے اندر کیا فرق آجائے گا یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی بلکہ موجودہ حالت ہی میں وہ پرمننٹ چپراسیوں کے مقابلے میں خود کو بہتر سمجھتا تھا کیونکہ ایک تو وہ اتنے بڑے افسر کے بنگلے میں رہا کرتا تھا۔ اور دوسرے چپراسیوں خلاصیوں کی طرح اسے بے ڈھب اور بد رنگ وردی نہیں چڑھانی پڑتی تھی۔

پر ایک دن پھر کچھ ایسی بات ہو گئی کہ اپنے مالکوں سے اسے اپنی تنخواہ کے بارے میں پوچھنا پڑا جس پر مالکوں نے اسے شک اور غصے کی نظر سے دیکھا جبکہ یہاں غصے کا کوئی موقع تھا اور نہ شک کی کوئی گنجائش۔ جہاں تک دھرو چند کی نیت کا سوال ہے تو قسم کھا کر کہا جا سکتا تھا کہ بالکل پاک صاف تھی۔ قصہ اصل میں یہ تھا کہ صاحب نے ایک موٹر گاڑی خرید لی تھی جسے دھرو چند بڑے پیار سے دھوتا تھا۔ جیسے بے جان مادے کی موٹر نہ ہو بلکہ اس کے گاؤں کی بچھیا ہو۔۔۔ یہ موٹر تھی بھی تو چھوٹی موٹی بچھیا کی طرح۔ ماروتی۔ گرچہ اس کے آجانے پر دھرو چند کا کام بڑھ گیا مگر زیادہ کام سے وہ کہاں گھبراتا تھا۔ الٹا ایک دن یہ کہنے لگا کہ گاڑی بھی وہی چلایا کرے گا۔ بس ذرا چلانا سیکھ لے تو کسی ڈرائیور کو نہیں رہنے دے گا۔

صاحب نے جب یہ سنا تو اندر ہی اندر بد کے کہ اس گنوار کو نیا نیا شوق ہونے لگا۔ بھلا ئی گاڑی پر اسے ڈرائیونگ کون سیکھنے دے گا۔ مالک کا یہ عندیہ بھانپ کر اس نے کہا کہ نہیں پہلے وہ ڈرائیونگ اسکول میں ٹریننگ لے گا اور اسکول کی فیس اپنی تنخواہ سے بھرے گا تب صاحب کی گاڑی چلائے گا۔

گرچہ یہ ساری باتیں انتہائی نیک نیتی سے کہہ رہا تھا مگر صاحب کو شک ہوا کہ یہ پَر پُرزے نکالنے لگا ہے اس لئے اڑنے سے پہلے اس کے پر کترنے کے خیال سے صاحب نے کسی حد تک کرخت لہجے میں کہا۔

"مگر تم تو کیثر ول ہو ـ ـ ـ تین تین مہینے کے نوکر ـ ـ ـ پھر وقفہ ـ ـ ـ تو پھر تنخواہ کی کیا رٹ لگاتے ہو؟"

دھر وچند نے لاڈ سے پوچھا۔

جس مہینے ناغہ ہو گا اس مہینے آپ نہیں دیں گے؟ "

یہ سن کر صاحب نے اسے بڑی سختی سے ڈانٹ دیا۔ میم صاحب نے بھی چہرہ بگاڑ لیا۔ اپنے خلوص کی ناقدری پر دھر وچند کو غصہ تو خیر نہیں آیا صدمہ بہت ہوا جسے تنہا برداشت کرنا پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی نوکری عارضی ہے اور صاحب کے رحم وکرم پر ہے مگر پھر بھی وہ آفس کے چپراسیوں کی بات میں نہیں آیا۔ چپراسیوں کو تو خیر جانے دیا جائے وہ جو دھرنا دینے والوں کا لیڈر رہا کرتا ہے وہ بھی اکثر اسے سمجھانے کی کوشش کرتا مگر وہ ان کی کچھ سننے کی بجائے یہ کہتا ہوا بھاگ کھڑا ہوتا تھا کہ "میں تم لوگوں کے بہکاوے میں نہیں آنے کا۔" اس کے ہر بار کے اس جواب کو سن کر ہی ان لوگوں نے دھر وچند کو دھور بلکہ دھورواکہنا شروع کر دیا تھا۔

لیکن دھر وچند کو اس کا کوئی ملال نہیں تھا۔ ہاں ملال اس وقت ضرور ہوا جب گاؤں سے کوئی آیا اور اس کی معرفت باپ کا خط براہ راست اسے ملا جس میں باپ نے اپنی پریشانیوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ بھی لکھا تھا کہ تم کچھ پیسے بھیجتے ہو، پتہ نہیں کتنا ہوتا۔ جو بھی ہوتا ہے اسے مالک رکھ لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تم پر ہمارا جو قرض ہے، وہ وصول ہو گا۔

یہ جانتے ہی دھر وچند کا ماتھا چکرا اٹھا تھا اور ایک لحظہ کے لئے اس کا جی چاہا کہ دھرنا والوں کے لیڈر کے پاس جائے اور اس کی باتیں سنے۔

وہ خود دیکھ رہا تھا کہ ادھر صاحب اور میم صاحب اسے بے وقوف بنا رہے ہیں اور ادھر

ان کے سسرے باپ سے قرضہ وصول کر رہے ہیں۔ گویا وہ باپ بیٹے دونوں بندھوا مزدور ہیں اور بندھوا مزدور بنانے والے گاؤں سے شہر تک پھیلے ہوئے ہیں۔

سدا کیا پشتہا پشت سے چلے جانے والے دھرو چند کو جب خود یہ بات سمجھ میں آئی تو ایسا لگا کہ اسے ایک بہت تلخ سنگین اور انسانیت کش حقیقت کا گیان ہو گیا اور اس گیان کی تلخی اس کے سارے وجود میں رچ بس گئی۔۔۔ اس کے اندر غصے کا ایک آتش فشاں دہکنے لگا اور یہ آتش فشاں پھٹ کر باہر آنے کے لئے مچلنے لگا۔ لیکن یہ تو فوری گیان تھا۔۔۔ ایک سے ایک آتشیں جذبے کو قابو میں رکھنے اور ضبط کرنے کا مادہ بھی تو اس کے اندر صدیوں سے چھپا بیٹھا تھا۔ اس لئے اپنے سارے غصے اور تلخی کو دباتے ہوئے وہ صاحب کے پاس گیا۔

صاحب اس وقت بوتل رکھے ہلکی ہلکی چسکی لے رہے تھے اور میم صاحبہ اٹھلا اٹھلا کر کچھ باتیں کر رہی تھیں۔ بابا لوگ اپنے کمرے میں تھے۔ دھرو چند نے کبھی بھی بلائے بغیر صاحب کے کمرے کے اندر جانے کی جسارت نہیں کی تھی۔ لیکن آج جب وہ یہ کر گیا تو میم صاحبہ کو حیرت اور صاحب کو غصہ آیا۔ انہوں نے خشک لہجے میں پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے صاحب کہ ہمارے باپ کی حالت اچھی نہیں ہے۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

" ان کی چٹھی آئی ہے۔"

الگ سے چٹھی آنے کی خبر ان لوگوں پر بجلی بن کر گری اس لئے سنبھل کر پھر پوچھا۔

"تو ہم کیا کریں؟"

"ہم گھر جانا چاہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہیں گاڑی پر بٹھا دیا جائے گا۔"

"مگر خالی ہاتھ جا کر کیا کریں گے صاحب ۔۔۔ روپیہ پیسہ۔۔۔"

"تمہیں معلوم نہیں کہ ایک مہینہ پہلے تمہاری چھٹی ہو چکی ہے پھر روپیہ پیسہ کیسا؟"

"لیکن آپ تو پھر لگوا دیں گے نا۔۔۔ کچھ اپنے پاس سے دے دیجئے۔"

کیا پتہ تمہیں کب لیا جائے گا اور تمہیں گھر جانا ہے تو جاؤ۔"

یہ سن کر دھرو چند کے پاؤں تلے کی زمین کھسک گئی۔ میم صاحب کی بے تعلقی تو اور بھی کھلی۔ وہ کچھ اور کہے سنے بغیر اپنی پناہ گاہ کچن میں چلا آیا اور یہاں بیٹھ کر عجیب و غریب خیالات کے نرغے میں گھر گیا۔ جانے نیند کہاں روٹھ گئی تھی کہ دن بھر پھرکی کی طرح چکر لگانے کے باوجود اس کے پاس نہیں پھٹک رہی تھی۔ اور یہ رات اس کے لئے بڑی کٹھن ثابت ہوئی تھی۔

اس کے نخرے دیکھ کر صاحب کا پارہ ایک دم سے اوپر چڑھ گیا اور جس چیز کی وہ چسکی لے رہے تھے اسے گھونٹ گھونٹ پینے لگے تھے۔ میم صاحب بھی دم بخود تھیں۔

آج سے پہلے انہوں نے دھرو چند کے یہ تیور دیکھے ہی نہیں تھے۔ شوہر کی ناراضگی کے پیش نظر انہوں نے اس موضوع پر کچھ بھی کہنا سننا مناسب نہیں سمجھا۔ بس چپ چاپ پڑی رہیں۔۔۔۔۔ صرف پڑی رہیں۔ سونے کا سوال نہیں تھا۔ دونوں بچے دوسرے روم میں تھے۔ کچھ دیر کے بعد وہ بچوں کو دیکھنے اٹھیں تو دبے پاؤں کچن کی طرف بھی چلی گئیں۔ کچن کا لائٹ آن تھا اور دھرو چند بستر پر بیٹھا جانے کیا سوچ رہا تھا۔۔۔ غمزدہ اور نڈھال سا۔

تھوڑی دیر بعد کچھ آہٹ ہوئی تو وہ پھر کمرے سے باہر آئیں۔ دھرو چند بچوں کے کمرے سے نکل رہا تھا۔ ان کا دل دھڑک اٹھا۔ لپک کر کمرے میں گئیں۔ دونوں بچے ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے بے خبر سو رہے تھے اور دھرو چند کچن میں کسی چیز کو تر بیونت رہا تھا۔ اس کے ارادے خطرناک سے لگ رہے تھے۔ شوہر سے بھی کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں کہ کہیں غصے میں آکر انہوں نے کوئی سختی کی تو بنگلے کے باہر بھی شور ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ دھرو چند اتنی بھی کیا بدل جائے گا کہ کوئی غلط کام کر بیٹھے۔ لیکن پھر بھی شہروں میں لوگوں کو جان اور مال کا خطرہ تو لگا ہی رہتا ہے اس لئے انہوں نے سونے پر جاگنے کو ترجیح دی اور ساری رات خاموش پہرہ دیتی رہیں۔ بیچ بیچ میں کچن میں بھی جھانک لیتی تھیں جہاں دھرو چند بھی جاگ رہا تھا اور جھکا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ کیا لکھ رہا تھا یہ وہی جانتا تھا۔

صبح ہوتے ہوتے ان کی آنکھ جھپک گئی اور جب کسی نے دروازہ کھولا تو ان کی نیند ٹوٹ گئی۔ انہوں نے دیکھا کہ دھرو چند ہاف پینٹ اور بنیان پہنے بغل میں کاغذ کا کوئی پلندہ اور ایک موٹی سی دفتی دبائے نکل رہا تھا۔ انہوں نے بھاگ کر شوہر کو جھنجھوڑا اور بے خبر سوتے رہنے پر ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے سارا حال کہہ سنایا تو وہ بھی گھبرائے ہوئے اٹھے اور ہر کمرے اور الماری کو دیکھتے بھالتے کچن میں گئے۔

دھرو چند کا بستر پھیلا ہوا تھا جبکہ اٹھنے کے بعد پہلا کام وہ بستر کو سمیٹ کر ایک کنارے

رکھنے کا کرتا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ صاحب کے جو اُترن کپڑے اس کے تصرف میں تھے وہ بھی وہیں پڑے ہوئے تھے اور فرش پر کاغذ اور دفتی کی کترنیں اور بچوں کی رنگ برنگی ڈرائنگ پنسلوں اور کلر بکس کے ڈبے بھی پڑے ہوئے تھے۔

ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی۔ نہ تھا تو دھروچند۔ اب اسے کہاں ڈھونڈا جاتا۔ اس لئے کسی حد تک فکرمندی کے ساتھ معمول کے کام کئے جانے لگے۔ آج میم صاحب کو خود ہی کرنا پڑ رہا تھا۔ ایک امید تھی کہ غصہ اتر جانے پر دھروچند آجائے گا۔ جا بھی کہاں سکتا تھا۔ مگر بچوں کے اسکول جانے کی بات تو دور رہی، صاحب کے دفتر جانے تک نہیں آیا۔ تب کچھ تشویش بڑھی۔

تشویش اور فکر میں ڈوبے ہوئے صاحب جب دفتر کے لان میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ جس جگہ ہڑتال کرنے اور دھرنا دینے والے ریلوے کرمچاریوں کی ٹولی اڈے جمایا کرتی تھی اور جہاں پر قومی تقریبات کے موقع پر جھنڈا لہرانے کے لئے ایک پشتہ بنا ہوا تھا، اسی پشتہ پر دھروچند کھڑا تھا۔ ہاف پینٹ اور بنیان پہنے وہ بڑا ہی مضحکہ خیز لگ رہا تھا کیونکہ اس نے سینے پر اور پشت پر ایک ایک دفتی اسٹکار کھی تھی جس پر موٹے حرفوں میں لکھا تھا۔

"مزدور بھائیو! ہمیں بھی اپنے ساتھ سمجھئے اور انصاف دلوائیے۔"

اس سے بھی مضحکہ خیز بات یہ تھی کہ اس نے خانساماں والی بہت ہی اونچی دیوار کی وہ ٹوپی بھی پہن رکھی تھی جو اس نے ردی لہردار موٹے کاغذ سے تیار کی تھی اور جسے وہ ان کے کچن میں کھانا بناتے ہوئے اس وقت ضرور پہنا کرتا تھا جب وہ بہت ترنگ میں ہوتا تھا۔ اس ٹوپی پر بھی اس نے سُرخ رنگ سے لکھ رکھا تھا۔

بنگلہ پیون۔ دھروچند عرف دھورو۔

جوکھم

ایک ۔۔۔دو۔۔۔ تین۔۔۔ چار۔۔۔پانچوں پلیٹ فارموں پر بے انتہا بھیڑ تھی۔ تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ اس بھیڑ میں چیونٹیوں کی چال بھی نہیں چلا جا سکتا تھا۔ یہ نقشہ دیکھ کر رام گوپال جی کا ماتھا ٹھنکا۔ لگتا ہے ایک نہیں کئی گاڑیاں کینسل ہو گئی ہیں۔

ہر شخص بے تحاشا آ جا رہا تھا۔ اگر کوئی رکا ہوا تھا تو کسی خیال میں ڈوبا ہوا۔ کسی کو کسی کی پروا نہیں تھی۔ اتنی بھیڑ اور ایسی بے تعلقی۔ کوئی بریف کیس ہلاتا گزرتا تو اردگرد دیکھنے کی زحمت نہیں کرتا تھا۔ بلا سے کسی کو چوٹ لگے۔ سب کی نظر بجلی کے انڈی کیٹر پر تھی جس پر گھنٹوں پہلے آنے جانے والی گاڑیوں کا اشارہ تھا۔

بے پروا لوگوں کی بے حس بھیڑ گاڑیوں کے کینسل ہونے ہی پر اکٹھا ہوتی ہے ورنہ ہر شخص کو تو قیامت کی جلدی رہتی ہے۔ پہلی سے پہلی گاڑی پر سوار ہو کر۔۔۔۔ نہیں ٹھسا ٹھس بھرے ڈبے میں جس طرح بن پڑے پل کر یا پھر لٹک کر نکل جانے کی جلدی۔ اور جلد بازوں کو اگر اتنی دیر تک کوئی گاڑی نہ ملے تو ان کی بے چینی کا اندازہ ان کے علاوہ اور کون لگا سکتا ہے جنہیں سال میں دو چار بار خاص کر برسات میں گاڑیوں کے نظام میں خلل پڑنے کا اندازہ ہو۔ ایک دو گاڑی کینسل ہوتی ہے تب ٹھٹھ لگ جاتا ہے۔ صرف اسی ایک اسٹیشن پر نہیں بلکہ ڈیڑھ دو کلو میٹر کے فاصلے پر پڑنے والے درمیان کے تمام اسٹیشنوں پر۔

گرچہ رام گوپال جی کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مگر یہ تو پتہ چلنا ہی چاہئے کہ آخر ہوا کیا ہے؟ لیکن بتائے کون۔ اپنے اپنے وقت پر بلڈنگ سے نکلنے والا کوئی نہیں لوٹا تھا کہ انہیں حشر کے اس میدان میں پہنچنے سے بہت پہلے بس کے اڈے پر ہی پتہ چلتا کہ ٹرینوں کی گڑبڑی چل رہی ہے۔ کبھی بھی ایسا نہیں ہوتا۔ ایسا ہو جائے تو آدمی آئے ہی کیوں بس کی دھکا پیل برداشت کر کے۔ اور یہاں پلیٹ فارم پر بھی کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا یعنی وہ لوگ جو ان ہی کی طرح ۸۔۲۲ والی گاڑی سے اور اسی مخصوص بوگی میں سفر کیا کرتے تھے۔ آتا بھی کس طرح کہ۔۔۔ اتنی بھیڑ میں ساتھ آنے والا بھی ادھر ادھر ہو جائے تو اس جنم میں نہ ملے۔۔۔ مطلب یہ کہ اس سفر سے گھر لوٹنے پر پھر ملاقات ہو جائے تو الگ بات ہے۔

بریف کیس اٹھانے والے تو پیر یا گھٹنے پر چوٹ لگاتے ہی ہیں۔ یہاں تو ایک شخص اسٹیل کا ٹرنک اٹھائے چلا آرہا ہے۔ اسے تو کسی طرف نکلنے کی جلدی ہے۔ اس کی کوئی فکر نہیں کہ اس ٹرنک سے جسے وہ اپنے سر پر اٹھائے جارہا ہے کسی کا سر پاش پاش بھی ہو سکتا ہے۔

ایک مصیبت ہو تو آدمی برداشت کرے۔ پیٹی اور ٹرنک کے علاوہ چھتری والوں نے بھی عجیب طوفانِ بد تمیزی مچا رکھا تھا۔ بھیگی پتلون اور پانی سے بھرے برساتی جوتوں سے چھینٹے اڑاتے تو آتے ہی تھے۔ اوپر سے ٹپکتی چھتری کو بھی پلیٹ فارم کے بالکل اندر آجانے پر بند کرتے تھے۔ جو سوکھے تھے انہیں بھی تر کرنے کے لئے۔ ان لوگوں کے بے ہنگم پن کی وجہ سے پلیٹ فارم چہ بچہ بنا جا رہا تھا۔

رام گوپال جی کا ہمیشہ یہ اصول رہا تھا کہ علاج سے بہتر احتیاط ہے۔ کن کن باتوں کے لئے آدمی کتنوں سے الجھے گا اور الجھنے کا بھی کیا فائدہ۔ ٹوکنے پر بھی کوئی اپنی اصلاح نہیں کرتا بلکہ الٹا جھگڑا کرنے پر اتر آتا ہے یا کسی کو کچھ احساس بھی ہوا تو "سوری" کہہ کر آگے نکل جاتا ہے۔ یہ سب سوچ کر۔۔۔ نہیں یاد کرکے رام گوپال جی لکڑی کے بنے پرانے انڈی کیٹر کی اوٹ میں چلے گئے۔ انہیں کچھ زیادہ احتیاط بھی کرنی چاہئے۔ کڑی محنت اور وجہ بلاوجہ مسلط ہو جانے والے ٹینشن نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ سال بھر پہلے دل کے دو دورے پڑے تھے۔

یہ دل کا دورہ بھی اتنا عام ہو گیا ہے۔۔۔ ہو بھی گیا ہے یا ڈاکٹروں کو اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں رہ گیا ہے کہ جس کو چاہے ہارٹ اٹیک یا کینسر کا مریض بتا دے۔ ہر چند وہ بیماری کو اپنے اوپر مسلط نہیں ہونے دیتے مگر بالکل بے احتیاطی بھی تو برتی نہیں جا سکتی۔ خاص کر ایسی صورت میں جب خود بھی پتا چلتا ہو کہ پہلے جیسی بات نہیں رہی ہے۔ تیز چلنے یا سیڑھیوں پر چڑھنے میں ان کی حالت دگرگوں ہو جاتی ہے۔ چالیس پینتالیس سال کی عمر ہی میں اپنا یہ حال ہو تا: کچھ کر انہیں اپنے اوپر ترس آتا تھا۔ اس لئے احتیاط برتتے اور ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کرتے تھے۔

ٹھیک ہے آدمی کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے مگر رام گوپال جی کو صرف اپنی فکر تو نہیں تھی۔ بیوی بچوں کی بھی تھی۔ بچے جو ابھی پڑھ رہے تھے اور ان کے سامنے آنے سے کتراتے تھے کیونکہ ۲۵۔۳۰ کلومیٹر کا سفر روزانہ بھیڑ والی بس اور ٹرین سے کرنے پر ان پر جو تھکن طاری ہوتی تھی یا لوگوں کی ناگوار حرکتوں اور باتوں کو پیتے رہنے پر جو جھلاہٹ ہوتی تھی اسے گھر ہی جاکر تو اتارتے تھے۔ گھر کے علاوہ اور کہاں اتارتے کون برداشت کرتا۔ جس شہر میں بوڑھوں، عورتوں اور مریضوں کے لئے بھی بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ نہیں چھوڑتا وہاں ان کا غصہ اور جھلاہٹ کون

برداشت کرتا۔ ایک بیوی کے سوا؟ بچے تو سامنے آنے سے کتراتے ہی تھے۔ بیوی پر انہیں اس لئے غصہ آتا تھا کہ وہ کھانا وہ بناتی تھی جس کی ڈاکٹر اجازت نہیں دیتے تھے۔ تیل مسالے والی ترکاری۔ اس کا کہنا تھا کہ گرانی بہت زیادہ ہے اس لئے ایک ہی جیسا کھانا تیار کرتی ہوں۔ یہ نہیں سوچتی کہ رام گوپال جی کا وزن ہونے کو نہیں آتا۔ توند اسی طرح پھولی ہوئی تھی۔ کس کر بیلٹ باندھنے سے سانس لینے میں اور تکلیف ہونے لگتی تھی۔ ادھر بی۔پی بھی کچھ بڑھ چلا تھا۔

لیکن وہ بیماری کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دینے کے قائل تھے۔ اس لئے آمد و رفت اور اپنے کام دھام میں کوئی فرق نہیں آنے دیا تھا۔ اسٹاپ پر لاکھ بھیڑ ہو وہ پہلی بس پر سوار ہونے کے لئے ایسی چھلانگ لگاتے تھے کہ لوگ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ ٹرین پر بھی کسی سے پیچھے نہیں رہتے تھے۔ ہاں جب زیادہ بھیڑ ہوتی تھی تب زیادہ زور آزمائی نہیں کرتے تھے۔ نہ ہوا تو ایک آدھ گاڑی چھوڑ دی۔ اس کے بعد تو بیٹھنے لائق جگہ نہ ملنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

پر آج تو حد سے زیادہ بھیڑ تھی۔ ہوا کیا کوئی کچھ بتاتا بھی نہیں۔ اسٹیشن والے بھی کوئی اعلان نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنا کان لاؤڈ اسپیکر پر لگا رکھا تھا۔ ایک بار ان بالکل اسی جگہ تھا جہاں رام گوپال جی کھڑے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر اچانک بول پڑا۔ اس کی تیز آواز نے ان کے کان کے پردے پر چوٹ لگائی اور وہ چونک پڑے۔ جیسے کوئی زبردست دھماکہ سن کر بچہ چونک پڑتا ہے۔ بچے ہی کی طرح ان کا دل دھڑکنے لگا۔ اچانک بول پڑنے یا کسی چیز کے گر جانے پر گھر میں بھی ان کا یہی حال ہوتا تھا۔ اور پھر بیوی سے تو تو میں میں۔۔۔

انہوں سے سنا کہ بمبئی سینٹرل اور چرنی روڈ کے درمیان کوئی عمارت اس طرح گری ہے کہ ملبہ پٹریوں پر ڈھیر ہو گیا ہے اس لئے ایک لائن بے کار ہو گئی ہے۔ ساری گاڑیاں فاسٹ لائن سے آ جا رہی ہیں۔

بھیڑ کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ اعلان سنتے ہی لوگ فاسٹ لائن کی طرف لپکے۔ مگر رام گوپال جی نے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ بے تحاشا اندر گھس آنے والی بھیڑ کا سامنا کرتے ہوئے انہوں نے باہر نکلنے کی کوشش کی تاکہ جلد از جلد بس کی لائن میں جا لگیں۔ بھیڑ کے علاوہ سڑک ندی نالہ بنی ہوئی تھی۔ بغل میں بیگ اور ایک ہاتھ سے پتلون کی مہری اور دوسرے سے چھتری سنبھالے سڑک پر لگے پانی میں تھپ تھپ کرتے رام گوپال جی بس کی لائن میں لگنے چل پڑے۔

رام گوپال جی کو بروقت صحیح فیصلہ کرنے پر بڑی خوشی ہوئی۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی چھٹی حس بہت تیز ہے اس لئے صحیح نتیجے پر پہنچنے میں انہیں دیر نہیں لگتی۔ وہ پہلے ہی سے بھانپ لیتے

ہیں کہ کیا ہوگا اور گیا نہیں۔ لوگوں کو پہچاننے میں بھی انہیں دیر نہیں لگتی تھی۔

صحیح اور سچی باتوں پر تو وہ یقین کرتے تھے مگر چکنی چپڑی پر نہیں۔ اس لئے انہیں سیاست دانوں کے جھوٹے وعدوں پر کبھی یقین آیا اور نہ کبھی وہ جاگتے میں خواب دیکھنے کے قائل ہوئے۔ اپنے کام سے کام تھا۔ اس میں وہ ذرا غفلت نہیں کرتے تھے۔ ٹرین کا چکر چھوڑ کر بس کی لائن میں آجانے کا یہی سبب تھا۔ ورنہ وہ بھی ابنارمل حالت کا بہانہ کر کے چھٹی کر سکتے تھے مگر جب گھر سے نکل ہی پڑے تو کیا فائدہ چھٹی کرنے کا۔ اور خاص کر اس حالت میں جب بس کی لائن میں وہ بہت آگے تھے۔ بس شیڈ سے ذرا باہر۔ یعنی بس پر سیٹ ملنی ہی ملنی تھی۔ اس کے بعد جب بھی فونٹین پہنچے، کوئی حرج نہیں۔

سڑک پر بہتے پانی کے ریلے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی کیونکہ بارش ابھی ہو رہی تھی۔ کیو میں وہ چھتری لگائے تھے۔ پہلے تو انہیں یہ گیلا موسم اور ماحول اچھا نہیں لگا۔ لیکن نہ جانے کہاں سے ہوا کا ایک خوشگوار جھونکا آیا اور طبیعت خوش ہو گئی۔ بارش کے چھینٹے اور بھی لطف دینے لگے۔ طبیعت میں ایسی ترنگ بھر گئی کہ دائیں بائیں اور آگے پیچھے دیکھنے کا بھی خیال نہ آیا۔ ان چند منٹوں میں بس پر سفر کرنے والوں کی لائن کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی۔ لائن میں ہر قسم کے لوگ لگے تھے۔ کوئی اپنی چھتری میں چھپا تھا تو کوئی دوسرے کی چھتری میں سر ڈالے خوش تھا کہ وہ بھیگنے سے بچ رہا ہے حالانکہ سر کے سوا وہ پورے دھڑ سے بھیگ رہا تھا۔ رام گوپال جی کو یہ دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ بائیں طرف تو خیر سڑک تھی جس پر بھانت بھانت کی گاڑی سواری گزر رہی تھی بلکہ گھسٹ رہی تھی۔ داہنی طرف شاپنگ کمپلکس۔ ہر دکاندار نے سجی سجائی دکان پر تارپولین کا بدنما سا پردہ لٹکا رکھا تھا جس کے پیچھے شوکیس میں ایک سے ایک خوبصورت اور قیمتی چیزیں سجی ہوئی تھیں۔

موسلا دھار بارش اس شہر اور یہاں کے لوگوں کے سارے نظام کو درہم برہم کرنے کے بعد ختم چکی تھی مگر بوندا باندی جاری تھی۔ رام گوپال جی کو یہ بوندیں گدگدا رہی تھیں اور انہیں یہ دنیا بڑی خوبصورت لگنے لگی تھی۔ ساری چیزیں جیسے نکھر آئی تھیں۔ اتنے میں ان کی نظر اس دلکش عورت۔۔۔ عورت تو خیر نہیں، ۲۶،۲۵ سال کی پیاری سی لڑکی پر پڑی جو زوردار بارش کے دوران ترپال کے پیچھے دبکی کھڑی تھی۔ اس کی شکل اور قامت تو نہیں دکھ رہی تھی البتہ بارش کے چھینٹوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اڑسی ہوئی نیلی ساڑی کا ایک چھوٹا سا حصہ اور گوری گوری پنڈلیاں نظر آتی تھیں۔ رام گوپال جی جب داہنی طرف دیکھتے تھے تو یہ سب نظر آتا تھا مگر کبھی ٹریفک کے شور سے تو کبھی اپنی بس کو دیکھنے کے لئے ان کا دھیان بٹ جاتا تھا۔ اب کے جو داہنی طرف نظر گئی تو وہ پیاری

لڑکی خود دکھائی دی۔ شاید وہ بھی بس کے انتظار میں تھی مگر چھتری نہ ہونے پر دوکان کے سائبان میں چلی گئی تھی اور بارش کے تھمنے پر پردہ اٹھا کر باہر آگئی تھی جیسے شوکیس کا کوئی اسٹیچو ہو۔ رام گوپال جی کی طبیعت میں جو ترنگ آگئی تھی اس لڑکی کے درشن نے اسے دوچند کردیا۔ لڑکی کے تذبذب کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اسے اپنی چھتری میں آجانے کا اشارہ کیا تو وہ جیسے کچے دھاگوں میں بندھی چلی آئی۔ انہوں نے اسے اپنے پہلو میں جگہ دی اور اس کو چھتری کا پورا سایہ دے کر خود ایک طرف بھیگنے لگے۔ ننھی ننھی بوندیں جب ان پر پڑتیں تو وہ کپکپانے لگتے۔ پتہ نہیں کیوں؟ لیکن یہ کپکپاہٹ لذت انگیز ہی تھی۔

لڑکی سے انہوں نے بات چیت شروع کردی۔ اس نے دھلی دھلی آنکھوں کو اٹھا کر بتایا کہ اسے بھی فونٹین ہی جانا ہے۔ وہ گرچہ اب چھتری کے سائے میں تھی لیکن پہلے بھیگ چکی تھی اور نیلی ساڑی اس کے بدن سے اس طرح چپکی ہوئی تھی جیسے دھلے اور نکھرے آسمان کا کوئی ٹکڑا اس کے جسم سے آلپٹا ہو۔ لمبی چوٹی تر ہو کر جیسے جی اٹھی تھی کہ لڑکی کی ہر جنبش پر تڑپنے لگتی تھی۔

رام گوپال جی کو یہ ساری باتیں اچھی لگ رہی تھیں۔ اتنی اچھی کہ بس کے انتظار کی الجھن بھی ختم ہو گئی تھی۔ دفتر وہ کسی وقت بھی پہنچ جاتے تو حاضری لگتی ہی۔ وہ چاہ رہے تھے کہ ڈبل ڈیکر بس ہی آئے تو اوپر چڑھنے سے لاکھ گریز سہی مگر آج تو اوپر ہی جاکر بیٹھیں گے اور ڈیڑھ دو گھنٹے اس خوشگوار ماحول اور کیفیت سے لطف اندوز ہوں گے۔ لڑکی کو جس طرح چھتری میں بلایا تھا اسی طرح اسے بھی اوپر چلنے کو کہیں گے اور ساتھ ہی بیٹھیں گے۔ زندگی میں اتنی سی مسرت مل جائے۔ ملتی تو خیر ہے نہیں حاصل کی جاسکتی ہو تو اس مسرت کو حاصل کرنے میں کیا حرج ہے۔

اور جب بس آئی تو ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ رام گوپال جی کو اطمینان تھا کہ انہیں اور اس لڑکی کو آرام سے جگہ ملے گی مگر نہ جانے کہاں سے ایک بھیڑ آگئی جو بس پر ٹوٹ پڑی اور قطار میں کھڑے شرفا منہ تکتے رہے۔ رام گوپال جی بھی کیو توڑ کر لڑکی کا ہاتھ پکڑے بس کی طرف لپکے۔ اطمینان سے چڑھنے پر سب سماجاتے مگر یہاں تو سب طاقت آزمائی کررہے تھے۔ انہوں نے لڑکی کو آگے کر کے زور لگایا تو جو زیادہ جوان اور طاقتور تھے ان کے دھکے میں آکر یہ پیچھے آگئے۔ وہیں پر گٹر کا منہ ٹوٹے ڈھکن سے ڈھکا تھا۔ انہیں چوٹ آئی مگر پھر سنبھل کر یہ دیکھنے اٹھے کہ لڑکی کس حال میں ہے۔ لڑکی کہیں نظر نہیں آئی۔ انہوں نے دل میں سوچا کہ اگر وہ بس کے اندر جاچکی ہو تو بڑا اچھا ہے۔ بعد میں وہ بھی سوار ہو جائیں گے تاکہ کھڑے کھڑے سہی اس کے ساتھ سفر کرنے کا شوق پورا ہو جائے۔

پر اُن کا شوق دل ہی میں رہا۔ بس ایک جھٹکے سے چل پڑی۔ رام گوپال جی وہیں کھڑے اپنا حال دیکھتے رہے۔ ہاتھ اور پتلون میں کیچڑ لگی تھی۔ پر لوگوں نے یہ سب دیکھنے کے بجائے انہیں بالکل آگے کھڑا دیکھ کر چیخنا شروع کر دیا۔ وہ کہتے ہی رہے کہ لائن میں تھے۔ دھکم پیل کی وجہ سے بس میں سوار نہ ہو سکے۔ لیکن کچھ سننے کے بجائے لوگ ایک ہی رٹ لگاتے رہے کہ لائن میں آؤ۔

رام گوپال جی وہاں رکے جہاں کھڑے تھے اور نہ لائن میں لگنے بالکل آخر میں گئے۔ کیا پتہ پھر بس کب آئے اور آئے بھی تو وہ سوار بھی ہو سکیں۔ اس لئے پھر اسٹیشن کی طرف ہو لئے اور سانس درست کرنے کے خیال سے کہ بس پر چڑھنے کے لئے زور آزمائی کرنے پر ان کے سینے میں کچھ تکلیف ہونے لگی تھی۔ بکنگ آفس کے سائبان میں کھڑے ہو کر پتلون کو اور اوپر اڑسا اور بیلٹ کھینچ کر کچھ اور ٹائٹ کیا تاکہ پتلون کیچڑ میں لت پت نہ ہو۔

ابھی وہ وہاں کھڑے ہی تھے کہ ایک شخص آواز لگاتا آیا۔ بمبئی ٹیکسی جا رہی ہے۔۔۔ چلو ایک آدمی۔۔۔ ایک آدمی۔

رام گوپال جی نے سوچا کیا حرج ہے ٹیکسی ہی پر چلا جائے۔ مگر دام سن کر ان کا حوصلہ جواب دے گیا۔ ایک آدمی سے بیس روپے مانگے جا رہے تھے۔ یہ رکشہ اور ٹیکسی والوں کا جواب نہیں۔ **لوگوں کی پریشانی** کا دام وصولتے ہیں۔ جسے دیکھئے آدمی کی ضرورت کو کیش کرنا چاہتا ہے۔ اس کے **باوجود ممکن** ہے کہ وہ ٹیکسی پر بیٹھ جاتے مگر اپنے ہی جیسے ایک دل جلے کو جب یہ کہتے سنا کہ ورلی میں **اتنا پانی** جمع ہو گیا ہے کہ کوئی گاڑی آگے نہیں بڑھ رہی ہے" تو انہوں نے اس سے کوئی ایسا سوال نہیں کیا کہ ورلی جائے بغیر اسے یہ کیسے معلوم ہو گیا بلکہ تمام لوگوں کی طرح کسی بھی افواہ پر یقین کر لیا۔

رام گوپال جی پھر پلیٹ فارم پر گئے۔ بھیڑ کچھ چھٹ چکی تھی اور انڈی کیٹر پر نئی گاڑیوں کے اشارے درج تھے۔ کسی سے کچھ پوچھا تو نہیں کہ جواب ہی کون دیتا۔ البتہ ریلوے کے اناؤنسمنٹ پر کان لگا دیا۔ ایک بہت خوشگوار خبر ملی کہ ایک نمبر پلیٹ فارم پر یعنی جہاں وہ کھڑے تھے، آنے والی گاڑی چرچ گیٹ جائے گی۔ انہوں نے سوچا اب بیڑہ پار ہے۔ دفتر تو کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی جائیں گے۔ گاڑی میں داخل ہونے کی شرط تھی اور اگر سیٹ مل گئی تو کیا کہنے۔ ٹرینیں چونکہ نارمل نہیں ہیں اس لئے کوئی ضروری نہیں کہ کوئی گاڑی مقررہ وقت یعنی چالیس پینتالیس منٹ میں اندھیری سے چرچ گیٹ پہنچ جائے۔ اس لئے سیٹ حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

ٹرین ایک نمبر پلیٹ فارم پر آتی دکھائی دی تو انہوں نے کمر کس لی۔ باوجود اس کے کہ

ٹرین سے لوگ شہد کی مکھیوں کی طرح چمٹے ہوئے تھے انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ ان کی طرح دوسروں نے بھی پیترے بدلے۔ گاڑی کے رکنے سے پہلے کچھ لوگ اترے تو ان سے کہیں زیادہ اوپر اچک گئے۔ رام گوپال جی بھی اپنی بیماری و بیماری اور پھولتی سانس اور سینے کی تکلیف اور جلن کو بھول کر ڈبے کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ اس دھکم پیل میں ان کی سانس اور پھول گئی۔ اندر سے آنے والوں کے ریلے میں انہیں کئی بار پسپائی ہوئی مگر پھر آگے بڑھے۔ مگر بار بار آگے اور پیچھے کے دھکے کھانے پر ان کا سر چکرانے لگا۔ وہ نہ تو پوری طرح ڈبے کے اندر تھے اور نہ بالکل پلیٹ فارم پر۔ اوندھے منہ گر پڑے۔ چڑھنے والوں کو یہ سب دیکھنے کی کہاں فرصت، ان کو روندتے ہوئے ایک کے بعد دوسرے یعنی بہت سارے لوگ پار ہو گئے۔

جو لوگ ڈبے کے اندر نہیں پہنچ سکے تھے وہ گلیارے ہی میں کھڑے ہونے کے لئے دھینگا مشتی کرنے لگے۔ انہیں رام گوپال جی کے پڑے رہنے پر بڑی تکلیف اور کوفت محسوس ہو رہی تھی اس لئے وہ طرح طرح سے منہ بنا رہے تھے۔ ایک آدھ نے تو اپنے طور پر یہ خیال ظاہر کیا کہ صبح صبح انہیں چڑھانے کی کیا پڑی تھی۔ لیکن کوئی رام گوپال جی سے ان کی طبیعت کے بارے میں کچھ پوچھ رہا تھا اور نہ انہیں اٹھانے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔

وہ خود بھی نہیں اٹھ پا رہے تھے کیونکہ مزید جوکھم اٹھانے کی اب ان میں سکت نہیں رہی تھی۔

بن باس

اب یہ دوسری مصیبت آئی تھی جو ٹلتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ پہلے تو میں نے یہ سمجھا تھا کہ شور غل کر کے یہ اپنا بھاؤ بڑھا رہا ہے۔ جگہ کم اور مسافر بہت زیادہ تھے تو ریزروڈ کمپارٹمنٹ میں گھس آنے والوں کو منہ مانگی قیمت پر یہ انہیں جائز مسافر کا درجہ دے گا۔ لیکن جب یہ مول بھاؤ کرنے کے بجائے صرف اصول اور ضابطے کی باتیں کرتا رہا تو ایک لمحہ کے لیے مجھے یہ خیال آیا کہ یہ شاید ان بیوقوفوں میں ایک ہے جن کی تعداد خیر سے کم ہے مگر جو اصول پسندی اور ایمانداری کی رٹ لگا کر خود تو تنگ دستی کی زندگی گذارتے ہی ہیں، انتہائی ضرورت کی حالت میں کسی ریزرویشن کے بغیر اچانک سفر کرنے والوں کو بھی چین سے نہیں رہنے دیتے۔

انتہائی ہنگامی حالت میں ہم بمبئی واپس ہو رہے تھے۔ بڑی دوڑ دھوپ اور سفارش سے صرف ایک ریزروڈ برتھ ملا تھا۔ جبکہ میرے ساتھ میری بیوی بھی تھیں۔ ہم لوگوں کا سفر ٹائم ٹیبل کے مطابق گاڑی کے چلنے پر کم از کم چھتیس گھنٹے کا تھا۔ مگر عام طور پر مقررہ وقت پر شاید ہی گاڑی اپنی منزل پر پہنچتی ہے۔ لوگوں نے بھی یہ سمجھایا تھا اور مجھے بھی امید تھی آج نہیں تو دوسرے دن کوئی اور برتھ مل ہی جائیگا۔ ایک آدھ رات ہم لوگ ایک ہی سیٹ پر کسی طرح گزار لیں گے۔ ویسے دو سیٹوں کے بیچ والی جگہ پر بھی ہم نے نظر لگا رکھی تھی۔

مگر پہلی ہی رات ٹکٹ کی پڑتال کرنے جو ٹی ٹی آیا وہ بالکل الٹی کھوپڑی کا نکلا۔ ایک سے ایک پٹانے والے تھے مگر یہ کسی کے قابو میں آنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ جبکہ اور ٹی ٹی کچھ لے لوا کر کسی نہ کسی جگہ ایڈ جسٹ کر دیتے ہیں یا پھر ٹھس ٹھسا کر سفر جاری رکھنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ یعنی مسافروں کا بھی بھلا کرتے ہیں اور خود بھی فائدے میں رہتے ہیں۔ مگر یہ ٹی ٹی کسی اور مٹی کا بنا ہوا تھا۔ جو مسافر باضابطہ تھے ان کو چھوڑ کر سبھوں کو ہکال کر پلیٹ فارم پر اتار رہا تھا۔ حد تو یہ کہ پولیس کے ایک آدمی کو بھی جو کم از کم داروغہ ضرور تھا اور دروازے کے پاس اپنا بستر بند کھول کر آرام کر رہا تھا اسے بھی جب اس نے اتارے بغیر دم نہیں لیا تب میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے ٹکٹ بیوی کے حوالے کر دیا اور خود اس سے دور دور یہاں تک کہ پاخانہ میں بھی چھپتا پھرا۔ اس لکا چھپی میں بھی اطمینان نہیں تھا کیونکہ ہم میاں بیوی کا ٹکٹ مشترکہ تھا اور ایک ٹکٹ پر دو مسافروں کا نام دیکھ کر کہیں اس نے ڈپٹ کر کچھ پوچھا تو پتہ نہیں گھبراہٹ میں بیوی کیا کہہ جائیں اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ گھبراہٹ یا جوش میں یہ ایسی باتیں کرنے کی عادی ہیں۔

جن حالات میں اور جس ذہنی اور جذباتی کیفیت میں ہم لوگوں کو واپسی کا سفر کرنا پڑ رہا تھا وہی کیا کم تھا۔ ایک دو دن بعد سفر کا ارادہ کرتا تو یقیناً دونوں کو ریزروڈ برتھ مل جاتا اور یہ طویل اور صبر آزما سفر ہم لوگ کسی حد تک اطمینان سے کرتے۔

سارا سفر تو اطمینان سے نہیں گزرتا ہاں رات تو لیٹ پوٹ کر سفر کرتے ہی۔ کیونکہ صبح ہوتے ہی ریزروڈ کمپارٹمنٹ بھی ریزورڈ نہیں رہتا۔ گاڑی اگر میل ہو تو خیر ورنہ ہر چھوٹے بڑے اسٹیشن پر نئے مسافروں اور ان کے ساتھ آنے والی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ ساری باتیں لیوٹری میں سوچ رہی تھیں اور جان پر بنی ہوئی تھی کہ گاڑی کے سُست ہونے کا احساس ہوا۔ شاید کوئی اسٹیشن آرہا تھا۔ یہ کوئی بڑا جنکشن تھا۔ میں نے کان لگایا تو اس جلاد کی آواز سنائی نہیں دی۔ شاید وہ بھی اس اسٹیشن پر اتر گیا تھا یا کسی دوسرے ڈبے میں چلا گیا تھا۔

ڈرا سہما اپنی سیٹ تک آیا تو دیکھا کہ بیوی مخبوط الحواس سی بیٹھی تھیں۔ انہیں یہ فکر تھی کہ میں کہیں بھاگ تو نہیں گیا۔ لیکن مجھے آتا دیکھ کر ان کو کچھ اطمینان ہوا۔ مگر ہمارے مطمئن ہونے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ کیونکہ دو سیٹوں کے درمیان فرش والی جس جگہ کو میں نے تاک رکھا تھا اس پر کوئی اور مہربان کاغذ کا بستر لگائے آرام کر رہے تھے۔ آدمی ہمدرد تھے جب ہی تو لیٹے لیٹے ہمیں مشورہ دینے لگے کہ دونوں پرانی اپنے برتھ پر ایک کا سر دوسرے کا پاؤں کر کے چادر لپیٹ کر سو جاؤ۔ موسم خنک تھا اس لئے چادر لپیٹی بھی جا سکتی تھی۔ دوسرا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس لئے ذرا سا بھی وقت گنوائے بغیر ہم لوگوں نے ان کے مشورہ پر عمل کیا اور آئی بلا کو ٹالنے کی دعائیں کرنے لگا۔ دعائیں صرف اس بات کی کر رہا تھا کہ وہ ٹی ٹی پھر نہ آجائے ورنہ سچ پوچھا جائے تو یہ سفر جس طرح ہم لوگ کر رہے تھے اسے کچھ زیادہ تکلیف دہ نہیں کہا جا سکتا۔ بمبئی کی لوکل ٹرینوں پر جانوروں کی طرح لدے پھندے جو لوگ سفر کرنے کے عادی ہیں ان کے لئے یہ ہزار گنا آرام دہ سفر تھا۔

بمبئی کی لوکل ٹرینوں میں سفر اور خود وہاں زندہ رہنے کے جتن میں آدمی کی ساری حسیں مر جاتی ہیں۔ نہ مریں تو اس شہر میں زندہ نہ رہا جائے۔ بیسیوں سال پہلے ہم نے یہاں آکر ڈیرا جمایا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا۔ موروثی جائداد اتنی نہیں تھی کہ ہم دو تین بھائیوں اور ان کی آل اولاد کا گزر بسر ہو۔ ایک بھائی وطن میں ٹیچر تھے اور دوسرے جنہوں نے کچھ زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی پنچایتوں، بلاک آفس اور کورٹ کے چکر لگا کر کچھ پیدا کر لیا کرتے تھے۔ یہ بھی میں بس سنا کرتا تھا۔ ورنہ اپنی روزی روٹی حاصل کرنے کے لئے میں نے جو باہر کا رخ کیا تھا تو کئی جگہ پڑاؤ ڈالتا ہوا بمبئی میں آکر ٹکا تھا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ رہ کیا گیا تھا رہنے پر مجبور تھا۔ اسی لئے تو میں یہ کہا کرتا ہوں کہ پیٹ سے بمبئی ضرور پسند ہے دل سے بالکل نہیں۔

دل سے بھلا پسند بھی کس طرح آئے جبکہ آدمیوں کے اس جنگل میں آدمی تو بے انتہا ہیں مگر آدمیت بالکل نہیں۔ ساتھ کام کرنے اور ساتھ رہنے والے بھی ہیں اور ملنے ملانے والے بھی مگر سب کے ایک دوسرے سے ظاہری تعلقات ہوتے ہیں۔ ہمدردی اور اپنائیت کی کم ہی گنجائش ہوتی ہے۔ ہاں جب کوئی بڑا واقعہ یا ہنگامہ یا فساد ہوتا ہے تب لوگ ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں۔ اس کے بعد وہی پہلے والی حالت۔ سبھوں کا یہی رویہ ہوتا ہے۔ اس لئے کسی کو کسی سے شکایت بھی نہیں ہوتی۔ بس میکانکی طریقہ سے ہر شخص زندگی کے دن کاٹتا رہتا ہے۔

تاہم آدمی کا دل بھر بھی آتا ہے اور بھاری بھی ہوتا۔ اس کو ہلکا کرنے کے لئے کوئی کاندھا یا ہمدردی کے ساتھ دل کی بات سننے والا بھی تو کوئی چاہئے۔ جب ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے تب اپنے وطن کی طرف نظر جاتی ہے۔ جہاں میں پلا بڑھا تھا، جہاں کے محلے اور شہر سے میں واقف تھا۔ وہاں کے رہنے والوں کو جانتا پہچانتا تھا اور وہاں ہمارے بھائی بند بھی تھے۔ ان سبھوں کو دیکھنے اور ان سے ملنے کا بڑا دل چاہتا تھا مگر وطن تک کا سفر اتنا مشکل اور خرچ والا تھا کہ ہر خواہش کا دم نکل کر رہ جاتا تھا۔ ہاں جب کوئی خوشخبری یا غمناک واقعہ ہوتا تھا تو ادھر سے یا ادھر سے ایک خط چل پڑتا تھا۔ بمبئی میں جب فساد ہوتا تھا تو ہمارے رشتہ دار ہم لوگوں کی خیرت معلوم کرنے کے لئے تڑپ اٹھتے تھے یا وطن سے جب یہ خبر آتی تھی کہ فلاں نہیں رہے تو پرسہ کا ایک خط لکھ کر اپنے کو تسلی دے لیا کرتے تھے کہ ایک اہم فرض ادا ہو گیا مگر ایسے سنگین موقعوں پر بھی جانے کی ہمت نہیں جٹا پاتا تھا۔ کچھ دنوں پہلے وہاں زلزلے کے جھٹکے محسوس کئے گئے تھے تب بھی خط ہی کے ذریعہ حال احوال پوچھ کر اور سبھوں کے زندہ سلامت ہونے کی خبر پاکر اطمینان کر لیا تھا۔

مجھے یاد آتا ہے کہ اب سے کوئی دس سال پہلے وطن کا رخ کیا تھا۔ وہ بھی اس لئے کہ ہماری والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے آخری دیدار سے تو محروم رہا تھا مگر اس حادثہ کے بعد نہیں جانے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ اپنی تسلی اور بھائیوں کی دل جوئی کے لئے یہ قدم اٹھانا ضروری تھا۔ کیونکہ والدہ کا وجود ہم سبھوں کو باندھے ہوئے تھا۔ ان کے اٹھتے ہی یگانگت کا یہ رشتہ بھی کمزور ہوتا محسوس ہوا تھا۔ جب ہی تو زیادہ فرصت نہیں ہونے اور اس سے بھی زیادہ اپنے اپنے چھوٹے بچوں اور بیوی کو اکیلے چھوڑ کر آنے کا بہانے کر کے دو ہی دنوں میں لوٹ آیا تھا۔ مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ یہیں سے ہم لوگ اپنے اپنے چھوٹے دائروں میں قید ہونے لگے تھے۔

- - - - -

ادھر پھر اسی مٹی کی زیارت کا جذبہ مچلنے لگا تھا جس مٹی سے ہمارا خمیر تیار ہوا تھا۔ بات اصل میں یہ تھی کہ ان دس برسوں میں ہمارے بچوں کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی اور بڑے والا تو

نوکری سے بھی لگ چکا تھا۔ اس عرصہ میں ہم نے اپنا ایک چھوٹا سا گھر بھی حاصل کر لیا تھا حالانکہ بمبئی میں سب کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے گھر نہیں۔ مگر دور اندیشی اور ہوشمندی سے کام لیتے ہوئے پی ایف، لائف انشورنس اور ایچ ڈی ایف سے قرض لے کر گھر جیسی نایاب چیز کو حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ شکر ہے کہ ہمارے ریٹائرمنٹ سے پہلے جس میں اب کچھ دن باقی رہ گئے تھے، یہ سارے قرض ادا ہو چکے تھے۔ اس لئے یہ خواب دیکھنے لگا تھا کہ جب تک چھوٹے والا بھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا تو زندگی کے بچے ہوئے دن آرام و سکون سے گزارنے کے لئے وطن لوٹ جاؤں گا۔ پہلے تو ہماری بیوی اس خیال سے اتفاق نہیں کرتی تھیں کیونکہ بمبئی وہ کمبل ہے جو یہاں آنے والے کو جلدی چھوڑتا نہیں۔ لیکن وقت کے ساتھ بیوی کو بھی اس شہر سے بیزاری ہو چلی تھی یا زندگی بھر کی رفاقت کا کمال تھا کہ ایک بار چل کر وہاں کے حالات اور امکانات کا جائزہ لینے کے لئے تیار ہو گئیں۔ اصل میں انہیں بھی یہ اطمینان تھا کہ بچے اب ہوشیار ہو چکے ہیں اور ہمارے بغیر بھی وہ اچھی طرح رہ لیں گے۔

سو ہم لوگوں نے چلنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ بھائیوں کو اپنے ارادہ سے آگاہ کر دیا۔ اتنے بڑے شہر سے جا رہے تھے تو ہر چھوٹے بڑے کے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ لے جانا بھی ضروری تھا۔ پیسوں کا انتظام تو خیر کر لیا تھا مگر یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، کس کے لئے کیا تحفہ لیا جائے۔ بڑوں کا تو خیر سمجھے مگر بچوں کے متعلق کچھ طے نہیں کر پا رہے تھے کیونکہ ان دس برسوں میں معلوم ہی نہیں ہوا تھا کہ کون بچہ اور کس کا بچہ کتنا بڑا ہوا۔ بمبئی سے مٹھائیوں کے علاوہ کپڑوں سے اچھا تحفہ کیا ہو سکتا تھا اس لئے پتلون اور شرٹ کے پیس لینے کے بعد ایسی گاڑی میں ریزرویشن کروایا جو سیدھی جاتی تھی اور راستے میں کہیں ادلنے بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

قصہ مختصر یہ کہ ہم لوگ چل پڑے۔ چلتے وقت ریزروڈ کمپارٹمنٹ میں سفر کرنے میں بڑا اچھا لگا۔ لیکن جیسے جیسے گاڑی آگے بڑھتی جاتی تھی اس کی حالت خراب ہوتی جاتی تھی۔ کوئی قاعدہ قانون نہیں تھا۔ جس کا جی چاہتا تھا گھسا پڑتا تھا۔ پتہ چلا کہ دن کے وقت ریزروڈ کمپارٹمنٹ بھی ریزرو نہیں رہتا۔ ہاں دس بجے رات کے بعد اس ڈبے میں فالتو آدمی سفر نہیں کر سکتا۔ مگر یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ رات کے وقت بھی ریزروڈ ڈبہ بھیڑ یا دھسان تھا۔ کوئی نہ کوئی سوئے پڑے مسافروں کے سرہانے پائتانے ٹک جاتا تھا۔ شور غل اور آپا دھاپی جو تھی وہ الگ۔

یہ نقشہ دیکھ کر ہماری بیوی ہائے توبہ مچانے لگیں۔ کوفت تو ہمیں بھی ہو رہی تھی مگر کیا ہی کیا جاسکتا تھا۔ اوکھل میں جب سر دے دیا تھا تو موسل کی دھمک بھی سہنی تھی۔ غرض یہ کہ اس بھیڑ سے جوجھتے ہوئے ہم لوگ اپنی منزل کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔ بڑھنا بھی ایسا تھا کہ

گاڑی آدھے گھنٹہ فراٹے بھرتی ہوئی جب چلتی تھی تو راحت ملتی تھی مگر پھر جگہ بے جگہ رک جاتی تھی تو آگے بڑھنے کا نام نہیں لیتی تھی اور یہ رکنا بھی کچھ اسٹیشنوں پر نہیں ہوتا تھا بلکہ اسٹیشن کے آنے سے پہلے یا اس سے گزر جانے کے بعد گاڑی تھم جاتی تھی۔ سبب یہ بتایا گیا کہ لوگ اسٹیشن پر اتر کر گھر تک چل کر جانے کی زحمت سے بچنے کے لئے اپنے گھر یا محلے کے سامنے زنجیر کھینچ کر گاڑی کو لگام دے دیتے ہیں۔ کوئی روک ٹوک بھی نہیں ہوتی۔ بس گاڑی کو ٹھوک تھپک کر دوبارہ چلانے میں خاصہ وقت گزر تا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس گاڑی کو ہمیں دس بجے رات کو خیر باد کہنا تھا اس کا صبح تک ساتھ نبھایا۔

خدا خدا کر کے یہ صبر آزما سفر ختم ہوا اور اپنے وطن کی کھلی فضا کی صاف شفاف ہوا میں سانس لی تو نئی جان سی پڑ گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ سر ہی پر نہیں اپنے دماغ پر بھی جس بوجھ کو ڈھوئے چل رہا تھا وہ اتر گیا۔ بیوی کے چہرے پر بھی بشاشت آ گئی۔ تازہ دم ہونے کے لئے ہم لوگ ویٹنگ روم میں چلے گئے اور اچھی چائے یا کافی لانے کا آرڈر دیا۔ یہاں سے ہم لوگوں کو ایک اور شٹل پکڑ کر اپنے قریبی اسٹیشن تک جانا تھا۔ مگر شٹل کب کب جاتی ہے اس چکر میں پڑنے کے بجائے ہم نے دس بارہ کیلو میٹر کی مسافت کسی اور ذریعہ سے طے کرنے کی ٹھانی۔ چائے وائے سے نپٹ کر اسٹیشن کے باہر نکلے تو کھڑ کھڑاتے سائیکل رکشوں اور ان کے نیم مردہ ڈرائیوروں کو دیکھ کر فوراً یہ فیصلہ کر لیا کہ اس پر ہر گز نہیں جائینگے۔ ٹیکسی سے چلیں گے۔ جلدی بھی پہونچیں گے اور شان سے پہونچیں گے۔ ٹیکسی کے نام پر وہاں جیپ گاڑیاں تھیں جس میں مسافروں کو مویشیوں کی طرح ٹھونسا جاتا تھا۔ یہ منظر خاصہ دلدوز تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ہم پوری گاڑی لیں تو گاڑی والے کو کوئی اعتراض نہیں تھا بشرطیکہ پورا کرایہ بلکہ گھر تک پہنچانے پر ہم کچھ زیادہ کرایہ دینے کی ہمت کریں۔ اس شرط کو فوراً منظور کرتے ہوئے ہم لوگ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

صبح ہوتے ہی سورج کی طرح جب ہماری سواری دروازے پر لگی تو ہارن سن کر چھوٹے بڑے سب اچھل پڑے اور کودتے پھاندتے باہر آئے۔ مصافحہ کیا گلے ملے۔ چھوٹوں کو پہچاننا مشکل تھا اس لئے ان سے بعد میں تعارف حاصل کرنے کا ارادہ کر کے گھر کے اندر پہونچے تو وہاں بھی سبھوں کو کھلا ہوا اور والہانہ استقبال کرنے کے لے بے قرار پایا۔

- - - - -

خبر پھیلتے ہی پاس پڑوس کی عورتیں بھی اپنے اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجائے آنے لگیں۔ مسکراہٹ ان کے چہروں پر سجی ہوئی تو نظر نہیں آتی تھی البتہ مسکراہٹ کا شائبہ ضرور تھا۔ کیونکہ ان سبھوں کے چہروں پر وقت اور حالات نے ایسے نقش چھوڑے تھے کہ اکثر کو پہچاننا مشکل

ہو رہا تھا۔ جن کو بچی چھوڑ کر گیا تھا وہ بھی پژمردہ تھیں اور ان کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ پھر بھی سبھوں کے سوال کا ہنس ہنس کر جواب دے رہا اور ان کے حالات پوچھ رہا تھا کہ اچانک ہمارے بعد والے بھائی نے آواز لگائی۔

"آیئے! پہلے ناشتہ کر لیا جائے۔"

دستر خوان پر کچھ بچوں سمیت بیٹھنے کا الگ ہی لطف ملا۔ ایسا لگا شکار ہو جانے والا پرندہ کسی طور چھوٹ کر پھر اس پیڑ پر آ موجود ہوا ہے جہاں اس کا گھونسلہ تھا اور اس جیسی دوسری چڑیاں اور ان کے بچے چہچہا رہے ہوں۔ ان کے بیچ جیسے میرا بچپن لوٹ آیا اور بے ساختہ لکشمی حلوائی کی یاد آگئی جس کے گڑ کے کھجلے اور جلیبیوں پر ہم لوگ جان چھڑکتے تھے۔ زبان پر لکشمی کا نام آنے کی دیر تھی کہ ہمارے بھائی کی بیوی نے پڑوس کی ایک لڑکی کو پیسے دے کر لکشمی کے یہاں سے جلیبی لانے دوڑایا۔ جلیبی بمبئی جیسی صاف ستھری تو اس کی پہلے بھی نہیں ہوا کرتی تھی مگر مزہ، خستگی اور سوندھے پن میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ لیکن اب وہ بات نہیں رہی تھی کیونکہ شکر کی گرانی میں یہاں کے حلوائی بھی شیرینی کے لئے سائیکلامیٹ استعمال کرنے لگے تھے۔

خیر صاحب ناشتہ چائے سے نپٹنے کے بعد ہمارے بعد والے بھائی ایک ضروری کام سے کورٹ تک اور اس کے بعد والے بھائی ایجوکیشن آفس تک ہو آنے کی بات کر کے چلے گئے۔ بیوی عورتوں میں گھری کچھ اپنی اور کچھ دوسروں کی سننے سنانے میں مصروف ہو گئیں۔ بھرے پیٹ اور خنک ہوا نے لوری کا کام کیا تو بیوی کو ایک آدھ جھپکی لینے کا مشورہ دے کر خود جو دراز ہوا تو فوراً ہی نیند کی وادی میں چلا گیا اور ایسا گیا کہ سہ پہر کو جب سب لوٹ آئے اور ایک ساتھ مردوں اور عورتوں کے زور زور سے باتیں کرنے اور ہنسنے اور قہقہے لگانے کی آواز سنی تو میں بھی اٹھ بیٹھا۔

یہاں ایک بات بتانے میں کوئی حرج نہیں کہ ہمارا آبائی گھر میونسپل کے حدود سے باہر ہے اور پورا محلّہ آموں کے باغ میں آباد ہے۔ اس لئے چند قدم پر شہر ہے تو چند قدم بعد شہر نہیں رہتا۔ جس کی وجہ سے یہ جگہ بڑی پر سکون ہے۔ اتنی پر سکون کہ سناٹا بولتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ آم کے پیڑ سے جب کوئی پتا ٹوٹ کر گرتا ہے تو پٹ سے اس کے ٹوٹنے کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ فضائی اور صوتی کثافتوں سے بھرے شہر سے نکل کر یہاں پہنچنے پر ہمارے دل و دماغ کو بڑا سکون مل رہا تھا۔ صرف سکون نہیں، ایک طرح کی وارفتگی بھی۔ پانی بھی بڑا ہاضم تھا اس لئے ڈٹ کر جو ناشتہ کیا تھا وہ بھی چلے پھرے بغیر ہضم ہو چکا تھا۔ لہذا پھر کھانے کی ہانک لگی تو میں بھی تیار ہو گیا اور پھر اسی طرح دستر خوان سجا۔

سہ پہر کی چائے کے بعد میں نے کہا۔

”بھائی چالیس گھنٹے ریل کے ایک ہی ڈبے میں بند رہا ہوں جس کی وجہ سے ہمارے جوڑوں میں زنگ لگ چلا ہے اس لئے آپ لوگ اب ہمارے چلنے پھرنے کا انتظام کیجئے۔“

ایک ایک پیالی چائے پی کر باہر نکلنے کی صلاح ہوئی۔ ہم لوگ باہر نکلنے لگے تو بیوی بھی ساتھ ہو لیں تو میں نے انہیں روکا کہ یہ بمبئی نہیں اپنا وطن ہے جہاں عورتیں اتنی آزادی سے اندر باہر آجا نہیں سکتیں۔ یہ سن کر ہمارے بھائی نے بتایا کہ نہیں، اب یہاں بھی پہلے والی پابندی نہیں رہی ہے۔ یہاں بھی عورتیں بغیر پردے کے رکشہ پر یا پیادہ بھی باہر آتی جاتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک چادر اوڑھ لیتی ہیں۔ اب تو مسلمان لڑکیاں بھی اسکول کالج جانے لگی ہیں۔ سچ پوچھئے تو تعلیم کے میدان میں لڑکوں سے زیادہ اچھا لڑکیاں ہی کر رہی ہیں۔ پھر تو ہماری بیوی کے بھی ساتھ چلنے کا جواز نکل آیا اور پچھلے دروازے سے ہم لوگ آموں کے خاندانی باغ کی طرف چلے۔

باغ میں پہنچ کر مجھ پر ایک عجیب سی افسردگی چھاگئی کیونکہ لہلہانے والے سب کے سب پیڑ ہمیں خزاں رسیدہ، بوجھل اور تھکے تھکے سے لگے۔ بعض تو باقی بھی نہیں رہے تھے۔ صرف ان کا تھالا رہ گیا تھا۔ اپنے خیال کا اظہار کیا تو ہمارے بھائیوں نے بتایا کہ اصل میں پیڑوں کو کوئی بیماری لگنے لگی ہے جس کی وجہ سے یہ مرجھاتے اور سوکھتے جا رہے ہیں۔ وہ تو بلاک آفس میں اپنا کچھ اثر ہے کہ وہاں سے لوگ آکر جڑوں میں کھاد پانی اور شاخوں پر چھڑکاؤ کر جاتے ہیں تب کچھ پھل آجاتے ہیں۔ بس برائے نام سمجھئے۔ لیکن ہماری بیوی کی عقل کا تالا کچھ ایسا کھل گیا تھا کہ انہوں نے پیڑوں کی بیماری ویماری کو تسلیم نہیں کیا بلکہ جانے کب اور کس سے سنی ہوئی بات کو دوہرایا کہ۔

”نہیں ... وقت سے پہلے پھل توڑنے پر پیڑوں کی جان پر بن آتی ہے۔ آپ لوگ ہر سال آم بیچ دیتے ہیں اور کنجڑے وقت سے پہلے ہی پھل توڑ لیتے ہیں کہ ایک دانے کا بھی نقصان نہ ہو۔“

یہ سن کر ہمارے بھائیوں کے چہروں پر ناگواری کا سایہ پھیل گیا۔ میں نے کڑی نظر سے بیوی کی طرف دیکھا مگر وہ باغ سے آگے کسی نئے باغ کی طرف متوجہ تھیں۔ وہ باغ کبھی کھلی زمین تھی جس میں موسم کے اعتبار سے کبھی بھٹے تو کبھی اولھا اور کبھی مٹرا گا کرتے تھے۔ پتہ چلا کہ ہمارے جو بھائی ٹیچر تھے اور جنہیں اسکول میں زیادہ وقت دینا یا محنت نہیں کرنی پڑتی تھی، سارا زور لگا کر اس زمین پر آموں کے نئے پیڑ لگائے ہیں اور اس طرح جوان پیڑوں سے آباد ایک نیا باغ لگ گیا ہے۔

ہمارے لئے تو یہ خبر قابل رشک تھی مگر ہماری بیوی کی جیسے شوق ملکیت اور حصہ داری کی ساری حسیں جاگ اٹھی تھیں اس لئے انہوں نے یہ جتانا ضروری سمجھا کہ۔

" آپ ہی لوگ مزے میں ہیں۔ ایک ہم لوگ ہیں کہ برسوں سے خاندانی باغ کا ایک آم بھی نہیں چکھا ہے۔ سال کے سال دو چار خرید کر اپنے بچوں کو آم اور اس کے سواد سے روشناس کراتے ہیں۔ اب تو آم بھی اکسپورٹ ہونے لگے ہیں۔ اس لئے کیا مجال کہ یہ پھل اب کوئی جی بھر کے کھا سکے۔"

خفیف ہو کر ہمارے بھائیوں نے کہا۔

"تو منع کون کرتا ہے آم کے زمانے میں آیئے اور خوب آم کھایئے۔"

بیوی نے کہا

"آنا جانا اتنا آسان کہاں ہے۔ آپ لوگ پارسل بھی تو کر سکتے ہیں۔"

فضا میں ناگواری کو محسوس کرتے ہوئے میں نے خاصے سخت لہجے میں کہا۔۔۔

"سارے مزے تو نہیں لوٹ سکتیں۔ بمبئی میں بھی رہینگی اور وطن کی نعمتوں سے بھی لطف اندوز ہونا چاہتی ہیں۔ یہ تو نہیں ہو سکتا۔ اس وجہ سے بھی نہیں ہو سکتا کہ یہاں صرف نعمتیں نہیں زحمتیں بھی ہیں۔ یہاں رہنا کچھ آسان نہیں۔ یہ تو انہی لوگوں کا دل گردہ ہے کو اس ڈیوڑھی کو آباد کئے ہوئے ہیں۔"

اس کے بعد میں گھر کی طرف یہ کہہ کر پلٹا۔

" چلو اندھیرا ہو رہا ہے۔ یہاں سانپ بچھو بھی بہت نکلتے ہیں۔"

گھر میں پھر بیٹھک جمی اور اگلی پچھلی باتیں نکلیں تو یوں سمجھئے کہ اگر کوئی ناگواری پیدا بھی ہوئی تھی تو ختم ہو گئی۔ دیر رات تک گپ شپ کا سلسلہ چلتا رہا۔ پھر کھانے کا دور چلا۔ کوئی دس بجے سونے سلانے کی تجویز منظور کی گئی۔ جبکہ بمبئی میں اس وقت شام ہی سمجھی جاتی ہے۔

ہمارا پشتینی گھر دو تین کمروں اور دالان پر مشتمل ہے۔ دونوں بھائی اور ان کے بیوی بچے یہیں رہتے ہیں جو بھائی ٹیچر ہیں وہ اپنا نیا مکان بنوا رہے تھے جو ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ اس اثناء میں ایک ترقی یہ ہوئی تھی کہ محلہ میں بجلی آگئی تھی مگر اس کے باوجود گیس لائٹ اور لالٹینوں کا بھی انتظام تھا۔ کیونکہ بجلی کی آنکھ مچولی جاری رہتی تھی۔ ہمارے بستر کے قریب ہی لوٹے میں پانی اور ایک دھیمی جلتی ہوئی لالٹین رکھ دی گئی تاکہ رات برات اٹھوں تو کوئی تکلیف نہ ہو۔

مکان دو تین کمروں اور دالان کا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ کم کشادہ تھا۔ ہاں برسوں سے رنگ و روغن سے ضرور محروم تھا۔ ہمارے بمبئی کے ایک روم ہال کچن کے کئی فلیٹ اس میں سما

سکتے تھے۔ اتنا ہی نہیں آنگن اتنا لق ودق تھا کہ بچپن میں ہم سب سگے اور چچیرے بھائیوں کے علاوہ پڑوس کے بھی دو چار ہم عمر بچے اس میں باضابطہ فٹ بال کھیلا کرتے تھے کیونکہ بیٹھک کے سامنے جو افتادہ جگہ تھی اس پر بڑے لڑکوں کا قبضہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس کشادہ ماحول سے دور اور تنگ و کم کشادہ جگہوں پر گزر بسر کرنے پر آدمی کی طبیعت اور دل میں بھی کیا تبدیلی آجاتی ہے اس کا صاف صاف پتہ ہمیں اس وقت چلا جب رات کے کسی پہر میں استنجا کرنے اٹھا تو باوجود یہ کہ مدھم ہی سہی لالٹین روشن تھی اور رات کے وقت کھپت کم ہو جانے پر بجلی بھی آگئی تھی، مجھے کچھ گھبراہٹ، گھبراہٹ ہی نہیں خوف کا احساس ہوا۔

خوف کے مارے میں نے تیزی سے آکر اپنے بستر میں پناہ لی اور چھیڑ کرتی خنک ہوا سے بچنے کے لئے پائنتی میں پڑی چادر کو اوڑھ لیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ صرف بجلی ہی کی روشنی نہیں ہے بلکہ چاندنی بھی کھلی ہوئی ہے اور آنگن میں لگے بیلے کے پھول کی مہک سے اور پڑوس میں کہیں لگے رات کی رانی کی خوشبو سے اور آم کے بوروں کی کھٹی مٹھی باس سے ساری فضا اس قدر مہکی ہوئی ہے کہ روح تک معطر ہو رہی ہے۔ اس عطر بیز فضا میں جسم و جاں کو ایسی فرحت ملی کہ میں پھر گہری نیند سو گیا اور اس وقت تک سوتا رہا جب گھر کے ہر چھوٹے بڑے جاگ اٹھے۔ وضو اور نماز کے ذکر کے ساتھ لڑکے اور لڑکیوں کے اسکول و کالج جانے کی تیاریوں کا بھی اندازہ مل رہا تھا۔ ان کے ناشتہ اور چائے کا بھی انتظام کیا جانے لگا تھا۔ ویسے بچوں کے لئے چائے پانی کا کوئی نوابی انتظام نہیں ہو رہا تھا۔ کسی کو گھی اور گڑ کے ساتھ تو کسی کو شکر اور ملائی کے ساتھ تو کسی کو چائے میں روٹی ڈبو کر کھانے کی تلقین کے ساتھ یہ بھی بتایا جا رہا تھا کہ انڈے اور سبزی وغیرہ کا جو انتظام ہے وہ مہمانوں ..... یعنی میں اور میری بیوی کے لئے ہے۔ یہ سن کر اپنے ہی گھر میں خود کو بطور مہمان آنے کا احساس کھل گیا۔ مگر ایک لحاظ سے یہ حقیقت تھی۔ اسی حقیقت کے تحت میں بھی انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔ نہ پیٹھ کا درد تھا اور نہ بدن ہاتھ میں کھینچ تان..... بالکل تر و تازہ اور چاق و چوبند اٹھا۔

بچوں کے چلے جانے پر گرچہ وہ گہما گہمی نہیں تھی جو ان کے وجود کی دین ہوتی ہے۔ مگر بڑے تو تھے۔ ان سے پھر گپ شپ چلنے لگی اور ایک ہی دن میں اپنے وطن کی فضا نے میرے اندر جو جادو جگایا تھا اس کے زیر اثر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکا کہ...

''بھائی جو بھی ہو ریٹائر ہونے کے بعد بچے چاہے بمبئی میں رہیں میں تو یہیں چلا آؤں گا۔''

اس پر بھائیوں نے کسی جوش یا مسرت کا اظہار نہیں کیا۔ ہاں جب میں نے اگلا جملہ کہا تو

وہ سب بھی کھل اٹھے۔ میں نے کہا....

"کوئی جگہ دلواؤ کہ میں اس پر اپنا چھوٹا سا مکان بنوالوں۔"

ناشتے چائے سے فراغت پاتے پاتے ہمارے بعد والے بھائی نے کہا۔

"ایک جگہ ہے۔ آپ کو دکھاتا ہوں۔"

اس کے بعد وہ اپنے موروثی مکان کے پچھواڑے لے گئے جہاں کسی پڑوسی کا مکان ہوا کرتا تھا۔ مگر اب اس جگہ ایک آدھ ڈھئی ہوئی دیوار یا ٹوٹے پھوٹے پختہ پشتے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا کہ دو بھائیوں کے جھگڑے میں بنا بنایا مکان نیست و نابود ہو چکا ہے اور اب یہ دونوں بھائی اسے فروخت کر کے اپنے حصے کی رقم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

بالکل پچھواڑے کی جگہ مجھے کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ ہمارے چہرے سے اس کا اندازہ کرتے ہوئے میرے بھائی نے پھر کہا۔

"آپ اطمینان رکھئے... بہت معقول دام پر میں آپ کو دلوادوں گا۔"

اس کے بعد ہم لوگ پھر اپنے گھر آئے تو آج انہیں بلاک آفس جانا تھا اس لئے دوپہر تک لوٹنے کا کہہ کر چلنے لگے تو چلتے چلتے دوسرے بھائی سے کہا۔

"چلو... آج تمہیں ٹیوشن پر جانا نہیں ہے؟"

"نہیں سوچ رہا ہوں کہ آج گول کر جاؤں۔"

وہ تو خیر چلے گئے مگر ہمارے دوسرے بھائی نے مجھے اپنے رہائشی حصہ میں بلا کر بٹھایا۔ تارپولین کے پردے سے حصہ الگ بنایا گیا تھا... انہوں نے اپنی بیوی کو ایک بار اور چائے پلوانے کی ہدایت دے کر دھیمے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

"پسند آئی آپ کو وہ جگہ؟"

"نہیں... وہ تو بالکل پیچھے کی زمین ہے؟

وہ ہنسے اور پھر بولے...

"اتنا ہی نہیں... وہ جھگڑے کی جگہ بھی ہے.. ملکیت متنازعہ ہے۔"

کھسر پھسر دیکھ کر ہماری بیوی کو بھی چین نہیں ملا اس لئے وہ بھی وہاں آگئیں۔

متنازعہ ہے تو مجھے کیوں دکھانے لے گئے؟"

''یہی تو بات ہے... کیا بتاؤں... یہ بالکل دنیادار ہو گئے ہیں... بلاک آفس اور کورٹ کے پھیروں نے انہیں ایسا بنا دیا ہے کہ پیسے اور اپنے فائدے کے علاوہ انہیں کچھ اور سوجھتا ہی نہیں۔''

''وہ تو خیر ٹھیک ہے... لیکن میرے ساتھ...؟

'' آپ کو کیا بتاؤں... ان کے سامنے روپے سے بڑا کچھ نہیں رہا ہے۔ اس کی وجہ سے خاصی بدنامی بھی ہوتی ہے۔ مگر انہیں نہ اپنی عزت کا خیال ہے اور نہ خاندان کی عزت کا۔ کھلی دلالی کرنے لگے ہیں... ہر طرح کی دلالی.... تھانے کی، کورٹ کی اور زمین جائداد کی بھی۔''

میری بیوی نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی مگر میرے دل پر کٹار سا چل گیا۔ زندہ رہنے کے لئے شریفوں کو بھی کیا کیا کرنا پڑ رہا ہے۔ انہوں نے تعلیم سے بے توجہی برتی تو اس حال کو پہنچ گئے ہیں۔ مجھے اس بات کا بھی بڑا قلق ہوا کہ ہماری حالت بھی ایسی نہیں کہ ان کے کام آسکوں۔ بمبئ میں دن رات ایک کر کے اتنا کماتا ہوں کہ اپنی گزر بسر ہوتی رہی ہے۔

میں نے کہا۔

''ہاں تنگی کی وجہ سے...''

ہمارا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی ہمارے بھائی بول پڑے۔

''مالی تنگی کس کو نہیں ہے... کیا ہمیں نہیں ہے۔ چھ چھ مہینے تنخواہ نہیں ملتی ہم لوگوں کو۔ وہ تو اپنی انگریزی اور میتھس اچھی ہے کہ ٹیوشن مل جاتی ہے.. اصل میں ان کی نیت اچھی نہیں ہے۔ حقداروں کا حق غصب کرتے ہیں۔ کل جو بھابھی کہہ رہی تھیں کہ آم کی فصل بکتی ہے تو واقعی بکتی ہے۔ مگر سب خود ہڑپ کر جاتے ہیں... خدا کی پناہ۔''

ایک تو مجھے یہ بات بہت کھلنے لگی تھی کہ ہماری بیوی ان کی بہت ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں دوسرے یہ کہ ہمارے بعد والے بھائی کی بیوی جو کل سے ہر طرح سے خاطر کر رہی تھی دور بیٹھی اس منظر کو دیکھ دیکھ کر بڑی دکھی اور دل گرفتہ سی نظر آرہی تھی۔ اس لئے میں نے اس گفتگو کا سلسلہ کاٹتے ہوئے کہا۔

''ارے کل سے جو آیا ہوں تو گھر ہی میں گھسا ہوا ہوں۔ آؤ ذرا باہر تو چلوں بیٹھک تک۔''

ہم دونوں بھائی باہر آئے۔ باہر بڑی ویرانی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوگی کہ بمبئ

جیسے گنجان اور بھیڑ بھاڑ والے شہر سے آنے کے بعد اس جگہ کا سکون اور خاموشی ویرانی نظر آرہی تھی۔ لیکن بات صرف یہ نہیں تھی۔ واقعی ویرانی تھی۔ دروازے پر کبھی مولسری کا ایک چھتنار درخت ہوا کرتا تھا۔ وہ نہیں رہا تھا۔ حالانکہ ابا کے زمانے میں اس پیڑ کی بڑی حفاظت کی جاتی تھی۔ اس پیڑ سے فائدہ اٹھانے کی اجازت ہر کسی کو تھی مگر احتیاط کے ساتھ ... مثلاً زچگی وغیرہ کے وقت زچہ کو جڑی بوٹی ملا جو پانی پلایا جاتا تھا اس میں مولسری کی چھال بھی ڈالی جاتی تھی۔ مولسری کا تنا چھیلنے پر اس کے سوکھ جانے کا اندیشہ تھا اس لئے اوپر کی پتلی شاخوں کی چھال اتارنے کو کہا جاتا تھا۔ ابا کے بعد شاید اتنی توجہ کسی نے نہیں دی اس لئے مولسری کا پیڑ سوکھ گیا اور وہ جگہ جہاں وہ پیڑ کھڑا تھا اب بالکل اجاڑ نظر آرہی تھی۔ اتنا ہی نہیں ہماری خاندانی بیٹھک جو کافی بڑی تھی اور ہمارے رہتے رہتے یہ بڑی پر رونق ہوا کرتی تھی۔ اب نہ صرف اپنی رونق سے محروم ہو چکی تھی بلکہ اس کی دیواروں میں شگاف پڑ چکا تھا اور کھپریل کی چھت ڈھنے کو تھی۔ میں نے اس پر اظہار افسوس کیا تو ہمارے بھائی نے بتایا۔

''دیکھ بھال نہیں ہو گی تو یہ ہو گا ہی۔''

میں نے کہا۔

''کیا سب مل کر بھی اس کی دیکھ ریکھ نہیں کر سکتے تھے؟''

''کس کو پڑی تھی۔ سو کی ایک یہ کہ ہم میں کسی کی اتنی فراغت بھی تو نہیں ہے۔''

''ارے میں بھی کچھ ہاتھ بٹاتا۔ یہ تو موروثی یادگار ہے۔ بمبئی وغیرہ میں قدیم عمارتوں کو بچانے پر خاص دھیان دیا جاتا ہے۔ تم اپنا علاحدہ مکان بنوا رہے ہو۔ چاہتے تو پہلے اس کی طرف توجہ دیتے۔''

''آپ بھی کیا بات کرتے ہیں۔ ہم دونوں کا چولہا چکی الگ ہے۔ اس پر بھی تو آئے دن ٹھنی رہتی ہے۔ عافیت اسی میں ہے کہ میں پورا گھر ان کے سپرد کر کے اپنا علاحدہ مکان بنوا لوں۔ آپ کو یہ سن کر افسوس ہو گا کہ آزادی سے ہم یہ بھی نہیں کر سکتے۔''

''وہ کیوں بھلا؟''

''بتاتا ہوں... اور چاہوں گا کہ آپ ہی ہمارا انصاف کریں... آنگن تو مشترکہ ہے نا؟ اپنے مکان کے حصے کے آنگن کو کچھ کشادہ رکھنے کے لئے میں نے دو ہاتھ زیادہ زمین لے لی تو ایک فوجداری کے علاوہ کیا نہ ہوا۔ ان کی حکومت اور پنچایت میں پہنچ ہے تو پنچایت تک بٹھادی۔''

''یعنی جس گھر میں دوسروں کی پنچایت ہوا کرتی تھی اس گھر کے لئے پنچایت بیٹھی۔''

"جی... اور اسی کی وجہ سے ہمارا مکان رکا پڑا ہے۔"

یہ خبر بڑی سوہان روح تھی۔ تکلیف کی شدت کو کم کرنے کے لئے میں نے چند قدم آگے بڑھ کر اپنے چچا کے باغ کا رخ کیا تو وہاں آم کے اتنے پیڑ نظر نہیں آئے جتنے ہوا کرتے تھے۔ اس کی جگہہ دو تین پختہ مکان دکھائی دیئے۔ پوچھنے پر ہمارے بھائی نے ایک اور قصہ سنانا شروع کر دیا۔ یہ قصہ چچازاد بھائی عبدالخالق کے متعلق تھا جو خاندان میں سب سے بڑے تھے اور دیوانی کورٹ میں ملازمت کیا کرتے تھے۔ کچھ تو ان کی طبیعت بھی ویسی تھی اور پھر اس محکمہ نے جہاں وہ کام کیا کرتے تھے انہیں کچھ اور پختہ کار بنا دیا تھا۔ وہ دور دراز کے رشتہ داروں کی یا کسی کی بھی چھوٹی بڑی زمین اور جائیداد کی تفصیل جمع کر کے متعلقہ مسودات جمع کیا کرتے تھے۔

ان سب کے باوجود چونکہ ان کا پورا پریوار چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے کا قائل نہیں تھا اس لئے دھرت بازیوں کے علاوہ انہیں اپنے حصے کے باغ کو رہائشی پلاٹ بنا بنا کر بیچنا پڑا۔ نتیجہ میں باغ کی جگہہ پر دو تین پختہ مکانات کھڑے ہوگئے تھے جن میں ایک تو سگریٹ فیکٹری سے ریٹائر ہونے والے کسی شخص کا تھا، دوسرا اس شخص کا جو دوسرے مذہب والوں کے محلّہ میں اکیلے رہنے کے بجائے یہاں منتقل ہو گیا تھا۔ جبکہ اس کے باپ دادا کو ایسے کسی مسئلہ کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ وقت وقت کی بات ہے اور یہ وقت ہی کی بات ہے کہ تیسرا مکان اس شخص کا تھا جس کی ماں ہم لوگوں کے یہاں تقریباً نوکرانی تھی مگر اسے عرب جانے کا موقع مل گیا تو اس نے نہ صرف یہ کہ اپنا پختہ مکان بنوایا بلکہ ان سے زمین خرید کر بنوایا جو کبھی اس کے پورے خاندان کے مالک ہوا کرتے تھے۔

میں نے حیرت اور افسوس کے ساتھ پوچھا۔

" تو کیا یہاں سے بھی لوگ عرب ممالک جانے لگے ہیں۔"

"عرب تو ایک آدھ ہی جا سکے ہیں۔ ہاں دلی اور بمبئی کا رخ ضرور کرنے لگے ہیں۔"

" ڈائریکٹ ٹرینیں جانے لگی ہیں شاید اس وجہ سے؟ "

"ایک وجہ یہ بھی ہے مگر بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں روزگار نہیں ملتا۔ ان شہروں میں جا کر یہ لوگ سخت سے سخت محنت کرتے ہیں اور گندی بستیوں میں رہتے ہیں لیکن کمائی اچھی خاصی کر لیتے ہیں اس لئے خود بھی ٹھاٹ باٹ سے رہتے ہیں اور اپنے گھر والوں کی بھی حاجت روائی کرتے ہیں۔"

"اچھا۔"

"جی ہاں... وہ لوگ جب آتے ہیں تو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ماں باپ چاہے لتوں

میں ہوں مگر خود پینٹ، بش شرٹ اور جوتے میں آتے ہیں۔ ہاتھ میں گھڑی بھی ہوتی۔"

"باہر جانے والوں کے یہ ٹھاٹ تو ہمیشہ رہے ہیں۔ لیکن واپسی کے ٹکٹ کے لئے ان بیچاروں کو کپڑے اور گھڑی تو نہیں بیچنی پڑتی ؟"

"بالکل ایسا ہی ہوتا ہے آپ کو کیسے معلوم ہوا ؟"

"اماں یہ کوئی نئی بات تھوڑی ہے۔ یہ تو ان کا مقدر ہے، بمبئی اور دلی میں کمائی چاہے جتنی بھی کر لیتے ہوں اور اس کے لئے انہیں کڑی سے کڑی محنت کیوں نہ کرنی پڑتی ہو جینا انہیں سیاستدانوں کے سائے میں ہی پڑتا ہے۔ ؟

"کیوں... کیوں ؟

"ایک آدھ ہوتے بھی ہونگے مگر ان شہروں میں بنگلہ دیشیوں کی تعداد لاکھوں میں جو بتائی جاتی تو ان ہی لوگوں کو گن کر تو.... خیر چلو ذرا خالق بھائی سے بھی مل لیا جائے۔"

"وہ ہیں نہیں... کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔"

"باہر کہاں گئے ہوئے ہیں۔"

"آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ یہ ہمیشہ کے لند پھند والے آدمی ہیں۔ ریٹائر ہونے کے بعد یہ ان کا فل ٹائم جاب ہو گیا ہے۔ اس لئے شکار کی تلاش میں کہیں بھی چلے جاتے ہیں۔"

گویا خالق بھائی کے لوٹ آنے کے بعد ہی ان کے یہاں جانا چاہئے۔ یہ طے کر کے ہم لوگ چلتے ہوئے اس مسجد کے پاس پہنچ گئے جو ہمارے اور خالق بھائی کے مکان کے بیچو بیچ تھی اور ہم لوگوں کے دادا نے جو اپنے وقت کے چھوٹے موٹے زمیندار تھے بنوائی تھی۔ چھوٹی سی مسجد تھی جو دو چار نمازیوں کے لئے اور برکت کے خیال سے بنوائی گئی تھی۔ مگر اب اس جگہ خاصی کشادہ مسجد کھڑی دیکھ کر مجھے کچھ حیرت ہوئی۔

" یہ مسجد اتنی بڑی کیسے ہو گئی ؟"

"چندے سے۔ خاص کر نئے آنے والوں نے اس کو وسیع کرنے کے لئے دریادلی کا ثبوت دیا ہے۔"

"مسجد تو بن گئی مگر نمازی ؟"

"نمازی بھی خاصی تعداد میں ہوتے ہیں۔ اب تو یہاں جمعہ کی نماز بھی ہوتی ہے۔"

"شاید آبادی بڑھنے پر؟"

"آبادی بھی بڑھی ہے۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ مذہب کی طرف لوگ زیادہ مائل ہونے لگے ہیں۔ جب ہی تو ایک چھوڑ دو مسجدیں بن گئیں ہیں۔ خلیفہ باغ میں بھی ایک مسجد بن گئی ہے۔ دلی بمبئی میں اس کے لئے کافی چندہ جمع کیا گیا۔ ۔

"اچھا"۔

"معلوم ہوا کہ بعض عرب ممالک تعمیر مسجد کے لئے کافی مدد پہنچاتے ہیں۔ آپ اپنی مسجد کے لئے بھی کچھ کیجئے نا۔"

میں بھلا کیا کر سکتا تھا۔ مجھے تو اس کی خبر بھی نہیں تھی اور مسجد کے بجائے تعلیمی ادارے کے لئے کوئی تجویز ہوتی تو میں اپنے خول سے باہر نکلتا بھی۔

خیر گھومتے گھماتے ہم لوگ پھر پشتینی بیٹھک کے سامنے آگئے جس پر بدلتے حالات کا کوئی خوشگوار اثر نہیں پڑا تھا۔ وارثوں کا حال نہیں بدلا تھا تو اس کا کس طرح بدلتا۔ اس لئے موسم اور وقت کے تھپیڑوں نے اسے شکستہ بنا کر رکھ دیا تھا۔

بیٹھک کے سامنے پہنچے تو ہمارے بھائی نے ایک بڑی اچھی تجویز رکھی۔

"کیوں نہیں اسے گرا کر اس جگہ آپ اپنا مکان بنوالیں؟"

"ہاں یار... خیال تو اچھا ہے تمہارا۔"

"ایک بات اور یہ کہ جو نئے نئے مکان بن رہے ہیں ان میں اپنے خاندان کے بھی کسی آدمی کا پختہ مکان ہونا چاہئے۔ اپنا مکان بنواتے بنواتے ہمیں کچھ تجربہ ہو چکا ہے۔ آپ رہیں یا نہ رہیں اپنی نگرانی میں آپ کا کام بھی کروادوں گا۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ہماے بعد والے بھائی جو کسی کام سے بلاک آفس تک گئے تھے واپس آگئے۔ مگر وہ بڑے نڈھال سے نظر آئے۔ ایسا لگا جس کام سے گئے تھے وہ بنا نہیں اور مفت کی دوڑ بھاگ کرنی پڑی۔"

جو بھی ہو ہم تینوں بھائی گھر کے اندر پہنچے تو دیکھا کہ ہماری بیوی دونوں دیورانیوں کے ساتھ محو گفتگو تھیں اور وہ دونوں بھی بڑی توجہ سے ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ ممکن ہے چمکتے دمکتے شہر بمبئی کے دلکش قصے سنا رہی ہوں۔ مگر انہیں بھی بمبئی کی چمک دمک کی کیا خبر ہوگی۔ صبح سے شام تک گھریلو کاموں سے ہی کہاں فرصت ملتی ہے... شوہر کو اور بیٹوں کو صحیح وقت پر رخصت

کرنے اور آتے ہی ان کی مدارت کرنے کے بعد وقت رہتا ہے اور نہ سکت... گنجائش بھی نہیں کہ بمبئی کی چمک دمک کا کبھی نظارہ کر سکیں۔ ہو سکتا ہے کچھ سنی سنائی ہی ہانک رہی ہوں۔ اس لئے میں نے سوال داغا۔

"کیا ہانک رہی ہو ان لوگوں کے سامنے؟"

"ہانکنے کیوں لگی؟"

"بمبئی سے آنے والے بڑے ماہر ہوتے ہیں ناہانکنے میں۔"

بات مذاق کی تھی اس لئے ہنسی مذاق میں ٹل گئی۔

دوپہر ہو چکی تھی اس لئے دن کے کھانے، قیلولہ اور ہلکی پھلکی گپ شپ کا سلسلہ چلتا رہا۔ گپ شپ کہئے تو انتہائی معمولی باتیں... عام اور معمولی آدمیوں کی باتیں۔ یہی کہ کون کس حال میں اور کہاں ہے، کون بچا اور کون اس دنیا سے سدھار گیا وغیرہ۔ جب شام کے سائے گہرانے لگے تب شہر کی طرف چلنے کی صلاح ٹھہری۔

کیلو سوا کیلو میٹر کی دوری پر شہر کی حد شروع ہو جاتی تھی۔ گھر سے وہاں تک سڑک پختہ تو ضرور ہو گئی تھی مگر کہنے کو کیوں کہ پتھر کے روڑوں پر کولتار کی پتلی سی تہہ بچھادی گئی تھی جس پر سواریاں کھڑکھڑاتی ہوئی گزرتی تھیں اور پیدل چلنے والے نشہ بازوں کی طرح لڑکھڑاتے ہوئے۔ سڑک کے دونوں طرف جو افتادہ اور خالی جگہیں تھیں وہاں دوچار دُکان کے کھوکھے کھڑے تھے یا نئے مکانات۔ ایک جگہ کولڈ اسٹوریج کی بے ڈھنگی عمارت تھی جو سبزی اگانے والے کسانوں کو اپنی فصل کو روک روک کر کافی منافع پر فروخت کرنے کے لئے بنائی گئی تھی۔

ایک جگہ ایک سینما گھر بھی سر اٹھائے ہوئے تھا جو حال ہی میں بنا تھا مگر پھر بھی بند پڑا تھا۔ پتہ چلا کہ ترقی پذیر ملکوں میں کل کارخانوں یا تفریحی عمارات میں بھی استعمال شدہ یا پرانی مشینیں اور آلات لگانے کا جو چلن ہے اور جس کے باعث اکثر حادثات ہوتے رہتے ہیں تو اس سینما گھر میں بھی پرانا جنریٹر لگا تھا جو کسی دن پھٹ پڑا اور تب سے سرکار نے اسے بند کروادیا ہے۔"

اس سے کچھ آگے ریلوے لائن تھی جو حد فاصل کا کام کرتی تھی۔ ریلوے لائن کے اس پار شہر کی گہما گہمی شروع ہو جاتی تھی۔ مگر اس وقت گہما گہمی قطعی نہیں تھی۔ بجھی بجھی سی اور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی کم اونچی عمارتیں تھیں جن کے اوپر آسمان جھکا پڑتا تھا۔ ایسا لگتا تھا یہاں آسمان کی دوری کم ہو گئی ہو۔ در و دیوار پر مسجد اور مندر کے متعلق پختہ رنگوں میں جو شیلے نعرے لکھے ہوئے تھے جو مدھم پڑ چلے تھے۔

ریلوے لائن پار کر کے ہم لوگ ایک چائے خانہ میں بیٹھے۔ چند بینچوں اور لمبی میزوں والے اس چائے خانے میں ہر قماش کے لوگوں کے آنے جانے کا سلسلہ تھا۔ چائے کی کم قیمت اور اچھے دودھ کی لذت کے علاوہ جس چیز نے مجھے اپنی طرف مائل کیا وہ اس جگہہ کا کھلا پن تھا۔ اوپن ایر ہوٹلوں کا میں دیوانہ ہوں۔ مگر بمبئی میں یہ کہاں میسر اس لئے یہ جگہہ مجھے بہت بھائی۔ دوسری جس بات نے توجہ کھینچی وہ بھانت بھانت کے کردار اور ان کا موضوع گفتگو تھا۔ یہاں چند عجوبہ روزگار بھی دکھائی دیئے۔ موٹر سائیکل پر دو افراد ایسے آئے جن کے آتے ہی تھوڑی سی ہلچل پیدا ہو گئی۔ یہ لوگ جن کی آنکھیں کھینچی ہوئی، مونچھیں اینٹھی ہوئی اور گلے میں رودر راکش کی موٹی موٹی مالائیں پڑی تھیں۔ یقیناً یہ کوئی خاص لوگ تھے۔ میری حیرت کی اس وقت انتہا نہیں رہی جب مجھے بتایا گیا کہ ان میں سے ایک ہمارے ہم جماعت تھے۔ نام سے وہ یاد آئے مگر کسی کے حلیہ میں ایسا انقلاب آسکتا ہے یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کالج کے ایک چھوٹے سے چناؤ میں یہ مجھ سے ہار گئے تھے۔ مجھے ہر طبقہ اور فرقہ کے لڑکوں نے سپورٹ کیا تھا جس پر انہوں نے بڑے دکھ کا اظہار کیا تھا خاص کر اس بنا پر کہ کالج کی مختلف سوسائٹیوں کے عہدہ داروں نے جنہیں اس چناؤ میں حصہ لینا تھا ایک غیر برادری والے کا ساتھ دیا تھا جس کے باعث انہیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ اب خیر سے شہر کے زبردست راشٹر یہ وادی نیتا تھے اور دھرم کے نام پر کی جانے والی سیاست کے طفیل ان کی بڑی دھاک تھی۔ یہ مجھ سے بھی اسی تیور سے ملے اور رسمی بات چیت کے بعد وہاں سے اس طرح چلے گئے جیسے مجھے ابھی بھی معاف نہیں کیا ہو۔"

ان لوگوں کے جانے کے بعد وہاں بیٹھے لوگوں نے ان لوگوں کی پھوٹ والی سیاست پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے سماجی انصاف کی سیاسی مہم کی بے تکان تعریف شروع کر دی۔ خاص کر اس وجہ سے کہ اس قسم کی سیاست مظلوم اور کمزور طبقات کو انصاف دلانے کے لئے چلائی جا رہی ہے۔ عوام کو کس کس طرح خوش فہمیوں اور امید موہوم میں مبتلا کیا جاتا ہے اس کا جادو اس نیم تاریک اور کم ترقی یافتہ شہر پر بھی چلا ہے۔ ہمارے لئے اس کی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ البتہ دو چار نوجوانوں کی سچی اور کھری باتوں نے مجھے اپنی طرف ضرور متوجہ کیا۔ یہ لوگ نثار نام کے اپنے کسی ساتھی کی سچائی اور ایمانداری کی لگاتار تعریف کئے جا رہے تھے جبکہ نثار کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ ان نوجوانوں کا وجود مجھے اس چراغ جیسا لگا جو ٹمٹماہٹ کے باوجود اندھیرے میں تھوڑی ہی سہی مگر روشنی پھیلانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

یہاں اور لوگ بھی ملے جن کے چہرے حالات کی زد میں آ کر اپنا اصلی رنگ روپ گنوا چکے تھے۔ ان کے بال سفید ہو چکے تھے، ان کے دانت ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے اور بعضوں نے

داڑھی بڑھار کھی تھی۔ ان میں سے کوئی آج بھی زندہ رہنے کی تگ ودو میں مصروف تھااور کسی کا لڑکا مودی خانہ، سبزی کی آڑھت یا ٹیلی فون بوتھ چلا کر اس گاڑی میں جٹ گیا تھا جسے آج سے پہلے ان کے باپ کھینچا کرتے تھے۔ قلق اس وقت ہوا جب ایک ہی عمر کے کئی ساتھیوں کے گزر جانے کی منحوس خبر سننی پڑی۔ لیکن سنانے والوں کا خیال تھا کہ سدھار کر انہوں نے اس دنیا کے مکروہات اور خراب زمانہ کی رنجشوں سے چھٹکارا پالیا۔

ہمارا دل بھی یہاں بیٹھ کر زیادہ خوش نہیں ہوا اس لئے گھر لوٹ پڑے۔ وہاں بچے اپنی اپنی پڑھائی، لڑکیاں ہانڈی چولہے اور بڑے نماز اور وظیفہ کی ادائیگی میں مصروف نظر آئے۔ پھر کھانے کا دور اور اس کے بعد بستر پر جانے کا وقت۔ انتہائی پر سکون ماحول میں نیند بھی جیسے دبوچ لینے کی تاک میں تھی۔ بہت گہری اور میٹھی نیند کے ساتھ مجھے ایک فکر... بڑی رات کو ضرورتاً تنہا اٹھنے اور بھائیں بھائیں کرتے ماحول میں انجانے خوف کا احساس جو شاید گھٹے گھٹے اور تنگ ماحول میں عرصہ تک رہنے کی دین تھا۔

صبح ہوتے ہی پھر معمولات کی گردان۔ اس دن ہمارے بعد والے بھائی کو کہیں جانا نہیں تھا۔ ہاں ان کے بعد والے ٹیوشن پر چلے گئے کہ روز روز تو گول نہیں کر سکتے تھے۔ عورتوں نے کونے کنارے جا کر اپنا اپنا راگ چھیڑا اور ہم دونوں بھائی اپنی اپنی رام کہانی سنانے لگے۔ دوران گفتگو میں نے بیٹھک والی جگہ پر اپنا گھر بنانے کی بات کی تو ان کا ماتھا سکڑ گیا اور انہوں نے بڑے رسان سے کہا۔

"ہم لوگوں کے چھوٹے بھائی نے شاید یہ شوشہ چھوڑا ہے۔ ان کے چکر میں آنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کسی معاملہ کو سلجھانے کے بجائے الجھانا چاہتے ہیں۔ ان کا قصہ سن کر آپ کو یقیناً افسوس ہوگا۔ انہیں اسکول میں نوکری مل گئی ہے مگر یہ لوگ بچوں کو پڑھاتے لکھاتے خاک نہیں، بس ٹیوشن کا چکر چلاتے رہتے ہیں۔ اوپر سے بچوں کے لئے دوپہر کا جو کھانا سرکار کی طرف سے آتا ہے اس میں سے بچوں کو کچھ دے دلا کر باقی مال یہ لوگ بازار میں بیچ دیتے ہیں۔ یہ مکان جو آپ دیکھ رہے ہیں اسی ناجائز آمدنی کی بدولت بن رہا ہے۔ اس کا جواب انہیں عاقبت میں دینا ہوگا۔ عاقبت تو دور ہے اسی دنیا میں دینا پڑتا ہے۔ ہم آپ سے جو کہنے جا رہے ہیں وہ یہ کہ ایک برائی کر کے آدمی کی نیت کتنی خراب ہو جاتی ہے کہ انہوں نے مکان بناتے وقت آنگن کے بڑے حصہ پر جو قبضہ کیا وہ تو الگ رہا اس بات کا خیال بھی نہیں کیا کہ ہمارے لئے بھی تو آنے جانے کا راستہ ہونا چاہئے۔ راستے کی بات تو جانے دیجئے موری نالی تک بند کئے جا رہے تھے۔ یہ کہاں کا انصاف تھا۔ اپنے بھائی اور اس کے بال بچوں کی فکر بھی اس شخص نے نہیں کی۔ یہاں تک کہ پنچیتا پنچیتی کی نوبت آگئی۔

اسکولی بچوں کے لئے دوپہر کا کھانا اب کم آتا ہے اس لئے ان کا مکان بھی آگے نہیں بن رہا ہے۔ آپ کو بیٹھک والی جگہہ پر گھر بنانے کا انہوں نے جو مشورہ دیا ہے تو میں سمجھا دیتا ہوں کہ اس چکر میں نہ آیئے گا۔۔۔ یہ آپ کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں کر رہے ہیں۔ ایک اور جھگڑا کھڑا کر کے اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ خود کھڑے ہو کر آپ کا مکان بنوانے کا جھانسہ دینگے۔ اصل میں آپ کے روپے سے اپنا گھر پورا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ سب سن کر آپ کو رونا آئے گا۔

سچ مچ مجھے رونا تو نہیں آیا مگر کہیں اندر اپنے دل کے خون ہونے کا احساس ضرور ہوا۔ خونین رشتہ داروں کے ایسے تعلقات دیکھ اور سن کر اور کیا ہو سکتا تھا۔

جب ہی اس تکدر سے نکلنے کا ایک موقع یہ نکل آیا کہ کسی بچے نے آکر خبر دی کہ محلے کے کچھ لوگ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ یہ جان کر مجھے اچھا لگا کیونکہ بمبئی میں رہتے رہتے ہم لوگ اس کے عادی ہو چکے ہیں کہ سال چھ مہینے قریب ترین آدمی سے بھی ملاقات نہیں ہوتی اور کبھی سر راہ لوکل ٹرین کے پلیٹ فارم پر یا ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم پر جاتے ہوئے پل پر کسی پر نظر پڑ بھی جاتی ہے تو کسی کو روک کر حال احوال دریافت کرنے کی مہلت کہاں۔ چہرے پر جھوٹی مسکراہٹ سجائے ہر آدمی گاڑی پکڑنے کا اشارہ کر کے ذرا سا بھی رکے بغیر بھاگا چلا جاتا ہے اور کوئی اس کا برا بھی نہیں مناتا۔

باہر محلہ والوں کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ ان لوگوں نے اس بات کی شکایت کی کہ اپنے وطن کو بالکل ہی بھول گئے۔ برسوں آنے کا نام نہیں لیتے۔ انہیں کون سمجھاتا کہ صرف ارادے اور خواہش سے بات نہیں بنتی۔ ارادہ کو عملی شکل دینے میں بڑا خرچ ہوتا ہے جس کو پورا کرنے میں برسوں گزر جاتے اور پرزے کی طرح جینے والے کو وقت کے گزر جانے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ پھر بھی خیر خیریت کے تبادلہ کا سلسلہ چلا تو مجھے یہ احساس کھائے جا رہا تھا کہ یہ ساری باتیں کھڑے کھڑے ہو رہی تھیں۔ کوئی جگہ ایسی نہیں تھی کہ جہاں اطمینان سے بیٹھ کر پرانے ساتھیوں اور محلّہ والوں کی باتیں سنتا اور اپنی سرگزشت سناتا۔ میرے دائیں بائیں دیکھنے پر ہمارے بھائی نے دو ایک ڈگمگاتی کرسیاں اور کھری چارپائی منگوا کر کانپتی کراہتی بیٹھک کے باہر لگوا دی۔ یہ بات مجھے اور بھی کھلی کہ کہاں وہ وقت تھا جب اس بیٹھک پر جمگھٹ رہتا تھا اور کہاں یہ نقشہ ہے کہ اس کے سائے میں دو گھڑی بیٹھنے کا بھی چلن نہیں رہا ہے۔

- - - - -

غرض اسی طرح شب و روز گزر رہے تھے کہ ایک صبح باہر سے کسی نے میرا نام لے کر

آواز دی۔ بڑھاپے سے متاثر آواز کو میں تو نہیں پہچان سکا مگر ہمارے دونوں بھائیوں کو ایسی مشکل پیش نہیں آئی۔ ان لوگوں نے چھوٹتے ہی بتایا کے خالق بھائی ہیں۔ میں نے انہیں اندر بلوانے کو کہا تو دونوں نے اپنے اپنے چہرے پر ایک ہی جیسا تاثر پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"چلئے... باہر چل کر پہلے آپ ان سے ملئے تو۔"

دیکھتے ہی خالق بھائی مجھ سے لپٹ گئے۔ ان کی جو بھی کارستانیاں رہی ہوں ان سے قطعی بے تعلق ہو کر میں ان کی محبت کا اثر قبول کئے بغیر نہیں رہا۔ اس اثر سے نکل بھی نہیں پایا تھا کہ وہ گھسیٹتے ہوئے اپنے گھر کی طرف لے چلے۔ گھر میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ بھابھی ایک تخت پر جانماز بچھائے تسبیح کھٹ کھٹا رہی ہیں۔ وہ کافی کمزور اور ضعیف ہو چکی تھیں۔ انہوں نے رقت بھرے انداز میں اس بات کی شکایت کی کہ میں تو اپنے وطن اور اپنے رشتہ داروں کو بالکل بھول ہی گیا ہوں۔ ان کی محبت بھری شکایتوں کو دور کرنے کے لئے میں نے جڑا کہ . . .

"اپنے وطن آنے اور آپ لوگوں سے ملنے کے لئے کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب میں مچلتا نہیں ہوں۔ بلکہ رات کے وقت تو میں روز ہی یہاں چلا آتا ہوں۔ خوابوں میں۔ مجھے اپنی مٹی بلاتی ہے۔ مجھے اپنی بنیاد آواز دیتی ہے۔ نوکری کی وجہ سے میں بمبئی میں بندھا ہوا ہوں ورنہ ریٹائر ہوتے ہی میں یہاں چلا آنا چاہتا ہوں۔ ایک چھوٹا سا گھر بنا کر میں یہیں آکر رہنا چاہتا ہوں۔ اپنے بچوں کی شادی بیاہ اپنے ہی لوگوں میں کرنا چاہتا ہوں تاکہ وہ اپنی جڑ سے بالکل کٹ کر نہ رہ جائیں۔

میری لن ترانیاں سن کر خالق بھائی اور بھابی کے چہرے پر عجیب سی چمک آئی۔ خالق بھائی نے کہا۔

"صرف باتیں کروگی یا کچھ چائے وائے بھی پلاؤگی۔ کتنے دنوں پر میرا بھائی آیا ہے۔"

پھر انہوں نے نام لے لے کر اپنی لڑکیوں کو بلایا کہ آکر ملیں اپنے بھیا چچا سے۔ تینوں لڑکیاں سمٹی سکڑی آئیں۔ پتہ نہیں یہ سب اتنی مرجھائی ہوئی کیوں تھیں؟ جوان جہان تھیں مگر ان کے چہرے جوانی کی دمک سے عاری تھے۔ بھائی صاحب نے بتانا شروع کیا۔ یہ سب سے بڑی ہے۔ میٹرک کے بعد اس نے آگے پڑھ کر نہیں دیا۔ دوسری والی نے بی اے کیا ہے مگر بیکار ہی ہے۔ بی ایڈ کے بغیر اسکول میں بھی جگہ نہیں ملتی اور کسی نوکری میں تو ہم لوگ بھیج نہیں سکتے۔ تیسری والی البتہ بی اے کے بعد بی ایڈ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

بس اسی طرح کی گھریلو باتیں ہوتی رہیں۔ مگر بھائی صاحب کی یہ بات میرے حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تھی کہ بی اے پاس کرنے کے بعد دوسری لڑکی کو کسی اور ملازمت میں بھیجنے میں کیا

عار تھا۔ مانا کہ اپنے خاندان، محلّہ اور شہر بھر میں مذہبیت کا غلبہ تھا۔ مگر دقیانوسیت نے اپنا جال نہیں پھیلایا تھا۔ تب ہی تو زیادہ سے زیادہ تعداد میں عورتیں اور ہر فرقہ اور طبقہ کی عورتیں شہر اور بازار میں نظر آتی تھیں۔ نوجوان لڑکیاں بس اور رکشے ہی پر اسکول کالج نہیں جاتی تھیں بلکہ سائکل چلاتی بھی نظر آتی تھیں۔ اور خوشحال گھرانے کی لڑکیاں ہلکی اور چھوٹی لونا اسکوٹر بھی۔

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے میں خالق بھائی اور ان کی اہلیہ کے ساتھ کافی دیر تک ادھر ادھر کی، ان کی اور اپنی باتیں کرتا رہا۔ لڑکیاں چپ سادھے دور بیٹھی رہیں۔ ان کو مخاطب کرتا تھا تو کھل کر کچھ کہنے کے بجائے ہوں ہاں کرکے یا پھر پھیکی، بے جان سی مسکراہٹ بکھیر کر رہ جاتی تھیں۔ جب کافی دیر ہوگئی تو پھر آنے کا وعدہ کرکے میں وہاں سے اٹھا تو ان لوگوں نے کم از کم ایک وقت اپنے یہاں کھانے کی دعوت دی۔ میں نے خوش دلی سے ہامی بھرتے ہوئے کہا کہ میں اکیلا نہیں، ہم سب بھائی آئیں گے۔ اس کے جواب میں ان لوگوں نے کہا کہ وہ لوگ تو آتے ہی رہتے ہیں تم اتنے دنوں بعد آئے ہو تو۔۔۔

اسے میں نے ان دونوں میاں بیوی کی کفایت سے بڑھی ہوئی کفایت سمجھا۔ خالق بھائی مجھے ہمارے دروازے تک چھوڑنے آئے۔ ان سے اندر چلنے کو کہا تو کسی کام سے بازار جانے کی بات کہہ کر لوٹ گئے۔

ہمارے دونوں بھائی اور ان کی بیویاں جیسے بے صبری سے ہماری واپسی کے انتظار میں تھے۔ ان لوگوں نے اتنی دیر تک آپس میں شاید کوئی بات چیت بھی نہیں کی تھی۔ جب ہی تو ہماری بیوی بھی دور ایک اوٹ میں چارپائی پر آرام کر رہی تھیں۔

مجھے آتا دیکھ کر سب سٹپٹائے۔ میں نے جب یہ بتایا کہ بھائی ان لوگوں نے تو دعوت بھی دے دی تو بھائیوں میں سے ایک نے کہا۔

"چل گیا ان لوگوں کا منتر۔"

'کیسا منتر؟'

دوسرے نے کہا۔

"آپ نہیں جانتے۔ میاں مٹھی کرن منتر پھونکتے ہیں اور بیوی بسی کرن منتر کی جاپ کرکے شکار کو پھنساتی ہیں۔"

"اماں نہیں ۔۔۔ وہ بھی تو بھائی ہیں آخر۔ اتنے دنوں کے بعد ملاقات ہوئی ہے تو کیا ان کا جی نہیں چاہتا ہوگا کہ کچھ خاطر کریں۔"

''اس غلط فہمی میں نہ رہئے گا۔''

''غلط فہمی وہمی بالکل نہیں ہے۔ میں تو یہ کہہ آیا ہوں کہ اکیلے مجھے دعوت منظور نہیں۔ ہم سب بھائی آئیں گے۔''

''خدا بچائے ان کے حرام کے مال سے۔''

بظاہر یہ باتیں مذاق میں ہو رہی تھیں مگر آخری جملہ جس طرح کہا گیا اسے سن کر مجھے کیوں تو ایسا لگا کہ۔۔۔ ''یہاں جائز مال تو کسی کا بھی نہیں پھر بھی ہر آدمی ایک دوسرے کی ناجائز آمدنی اور غیر اخلاقی رویہ کا بھانڈہ پھوڑتا ہے۔

اس کے بعد ماحول کچھ سنجیدہ ہو گیا تو موقع نکال کر میں نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا کہ ایک جگہ رہتے ہوئے اور اتنی قرابت مندی کے باوجود ان لوگوں میں دوری کیوں ہے۔ جبکہ میں کالے کوسوں دور اپنے رشتہ داروں کے لئے تڑپتا رہتا ہوں۔ جواب ملا۔

''دور رہتے ہیں اس لئے آپ کو معلوم نہیں کہ قریب کے یہ رشتہ دار کیسے ہیں؟ خالق بھائی اور ان کی اہلیہ نے تو خاندان کی ناک کٹوانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ بے ایمانی شیطانی جو کرتے ہیں وہ تو الگ رہا تین تین لڑکیوں کو بٹھائے ہوئے ہیں مگر شادی کسی کی نہیں کر رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔

''یہاں جہیز اور جوڑے جامے کی جو مصیبت ہے؟

''کاہے کی مصیبت؟ دوسروں کا مال غصب کرتے نہیں تھکتے اس لئے جیسی نیت ویسی برکت۔''

''ہم لوگوں نے ایک سے ایک رشتہ ڈھونڈ کر دیا مگر کوئی لڑکا ان لوگوں کو نہیں جچا۔ اب حال یہ ہے کہ ہمارے بھائی صاحب جنہیں بھائی کہنے میں بھی شرم آتی ہے ایرے غیرے کو لاتے ہیں اور ان کی بیوی کی وجہ سے وہ شخص بلا جھجک آنا جانا شروع کر دیتا ہے۔ وقفہ وقفہ سے لوگ بدلتے رہتے ہیں۔ پورے شہر میں تھو تھو ہوتی ہے۔''

یہ سن کر میں اپنے حواس کھو بیٹھا۔ یہ بالکل ماننے جیسی بات نہیں تھی جو ہمارے بھائی کہہ رہے تھے۔ چھوٹے موٹے جھگڑے ٹنٹے تو ہر جگہ ہوتے رہتے ہیں مگر ایسا الزام۔۔۔؟ میں نے اپنے طور پر حقیقت جاننے کا تہیہ کیا اور اپنے بھائیوں کی ناگواری کی پروا کئے بغیر اپنی بیوی کے ساتھ

خالق بھائی کی دعوت میں شریک ہوا۔

کھانے کے دوران اور کھانے کے بعد ان لوگوں نے تصویر کا دوسرا رخ پیش کیا۔ لڑکیوں کی شادی کے سلسلہ میں بے پناہ جہیز کے رواج کے حوالے سے انہوں نے اپنی معذوری ظاہر کی۔ ہمارے اس سوال پر کہ کیا ہمارے یہ بھائی لوگ جن کا یہاں کے سماج میں خاصہ اثر ہے اس سلسلہ میں کوئی مدد نہیں کرتے، خالق بھائی نے جو کچھ کہا اسے سن کر میرے ہوش ٹھکانے لگ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ ان لوگوں نے الگ الگ پٹھے پال رکھے ہیں۔ کوئی مذہب اور سماج کا ٹھیکیدار ہے تو کوئی تعلیم کے میدان کا۔ صحیح معنوں میں ان لوگوں کے یہ پٹھے کسی لائق نہیں ہیں۔ ہاں مار دھاڑ کرنے میں ضرور یکتا ہیں۔ بالکل غنڈے اور لفنگے لوگ ہیں۔ اپنے مخالفوں کو زیر کرنے کے لئے یہ لوگ ان عناصر کو استعمال کرتے ہیں۔ وہ لوگ بھی ان کا حکم بجالاتے ہیں کیونکہ انہیں تھوڑا بہت مالی فائدہ جو پہونچتا ہے۔

پر سکون اور روایتی ماحول میں جو افسوسناک تبدیلی آئی تھی اس کی روئداد سن کر ہمیں یقین تو نہیں آیا۔ تاہم ہمارا دل بیٹھنے لگا۔ مجھے لگا کہ چھوٹے چھوٹے مفادات کے یہ چھوٹے چھوٹے بندے اپنے بچاؤ میں اس قسم کے ناقابلِ یقین قصے سناتے ہیں جسے اور سننے کی تاب مجھ میں نہیں تھی۔ ہماری بیزاری کا اندازہ کرتے ہوئے ان لوگوں نے گفتگو کا موضوع بدل کر ہمارے اور ہمارے بچوں کے متعلق پوچھنا شروع کر دیا۔ بھابھی نے اس بات کی تعریف کی کہ ہم اپنے اصل سے ملنا چاہتے ہیں اور اس خیال کو بہت سراہا کہ اپنے لڑکوں کی شادی بیاہ بھی یہیں کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اپنا مکان بھی بنوانا چاہتے ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ پیٹ بھر کے کھانے اور جی بھر کے باتیں کرنے کے بعد جب ہم لوگ اٹھے تو بھابھی نے ہماری بیوی سے پھر آنے کو کہا اور یہ بھی کہ ان کی نظر میں ہمارے لڑکوں کے لائق کچھ لڑکیاں ہیں۔ ہماری بیوی کو ایک طرف لے جا کر انہوں نے کچھ اور بھی کہا جو میں نہیں سن سکا لیکن خالق بھائی نے اپنی اہلیہ کی بات کی خوب حمایت کی۔ اور پھر ہم لوگوں کو چھوڑنے ساتھ چلے۔

آتے ہوئے میں اس جگہ ٹھٹھک گیا جہاں سے وہ میدان شروع ہوتا تھا جس کے آخری سرے پر ایک بہت ہی گھنا اور دراز قد املی کا ایک پیڑ ہوا کرتا تھا۔ وہ پیڑ اس میدان کی آخری حد پر تھا۔ پھر بھی کچے پشتے سے میدان کی حد بندی کی گئی تھی۔ اس میدان میں ہم لوگ فٹ بال، والی بال اور کبھی کبھار بیڈ منٹن کھیلا کرتے تھے۔ شام کے وقت یہاں بڑی رونق رہا کرتی تھی۔ جاڑوں میں دھوپ کھانے کی غرض سے ہم لوگ چٹائی یا کمبل بچھا کر یہاں پڑھا لکھا بھی کرتے تھے۔

مگراب یہ ویران اور اجاڑ سا قطعہ اراضی تھا جس کی کوئی حد رہی تھی اور نہ املی کا وہ چھتنار درخت۔ اس میدان سے ہو کر اب جس کا جی چاہتا تھا آیا جایا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ سواریاں بھی گزرتی تھیں جس کی وجہ سے ایک بھدی سی لیک بن گئی تھی جو کسی بیوہ کی مانگ نظر آتی تھی۔

اس جگہ رک کر خالق بھائی نے کہا۔

''تم چاہو تو یہاں اپنا مکان بنوا سکتے ہو۔ میں اپنے حصے کی زمین تمہیں دے سکتا ہوں۔''

ان کے متعلق میں جتنا جانتا تھا یا یہاں آنے پر جو کچھ سنا تھا اس کے پیش نظر خالق بھائی کی اس فیاضانہ پیشکش پر میں جھوم اٹھا۔

اپنے بھائیوں کو ملول وافسردہ دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ انہیں خوش کرنے کے لئے میں نے خالق بھائی کے یہاں کی دعوت کا مبالغہ آمیز ذکر شروع کیا تاکہ ان کی بخالت کے پس منظر میں ہماری باتیں تفنن کا سبب بنیں۔ مگر اس کا کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ تب پھر میں نے میدان میں گھر بنانے کے لئے ان کی پیشکش کی اطلاع دی۔ اس پر ہمارے چھوٹے بھائی نے وہ رد عمل تو ظاہر نہیں کیا جو ہمارے بعد والے بھائی کا تھا۔ انہوں نے کہا۔

''دیکھئے ---- پھینکا نا انہوں نے اپنا جال۔''

''جال۔ جال کیسا؟''

''جی ہاں مکر کا جال۔۔ آپ کو جھگڑے مقدمے میں الجھانے کا جال۔''

''کیا کہہ رہے ہو تم؟''

''صحیح کہہ رہا ہوں۔ انہوں نے باغ کو رہائشی پلاٹ بنا کر بیچ دیا مگر وہاں بسنے والوں کو راستہ تو چاہئے۔ اس کی کوئی گنجائش انہوں نے نہیں نکالی تو جس طرح پانی اپنا راستہ نکال لیتا ہے اسی طرح ان لوگوں نے میدان سے راہداری نکال لی ہے۔ خالق بھائی چاہتے ہیں کہ یہ راستہ بند ہو مگر ان کے چاہنے سے کیا ہوگا۔ یہ اپنی ساری کوشش کر چکے اس لئے کسی اور کے کاندھے پر بندوق رکھ کر چلانا چاہتے ہیں۔''

گرچہ یہ بہت سادہ سی بات تھی مگر ہمارے حلق سے یہ اتری نہیں۔ اسی نشست میں ہمارے چھوٹے والے بھائی نے کہا۔

''بھائی صاحب کی آپ نے میزبانی کرلی۔ اب مجھے خدمت کا موقع ملنا چاہئے۔ جو بھی روکھا سوکھا میسر ہوگا۔ یہ آج سے ہمارے ساتھ کھائیں گے۔

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ مگر ایک بات سن لو۔۔۔۔ واقعی رو کھا سو کھا کھلانا ہے تو مجھے یہ منظور نہیں۔"

اس پر ایک قہقہہ پڑا اور ماحول میں جو ان دیکھا تناؤ تھا وہ ڈھیلا پڑا۔

شام کے وقت ہم لوگ پھر شہر کی طرف گئے اور اسی ہوٹل میں چائے پی۔ ہمیں ایسا لگا کہ اس چھوٹے سے شہر کا یہ کلب ہے جس میں شام ہوتے ہی ہر قماش اور عمر کے لوگ آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ آنے والوں میں کچھ نیک صورت بھی ہوتے ہیں اور کچھ ہیکڑی باز بھی۔ یہ دیکھ کر اچھا لگتا کہ ہر قسم کے لوگوں سے ہمارے بھائیوں کے مراسم اچھے تھے بلکہ کوئی نہ کوئی کسی بھائی کا تابعدار نظر آتا تھا۔

اس رات کو میں نے محسوس نہیں کیا مگر دوسرے دن سے یہ بات کھلنے لگی کہ معمول کے مطابق نہ صرف یہ کہ ان لوگوں کا کھانا پینا الگ بنتا تھا بلکہ یہ لوگ الگ الگ یعنی اپنے حصار میں بیٹھ کر کھایا پیا کرتے تھے۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کھانا چاہے اپنا اپنا کھائیں مگر ایک دستر خوان پر بیٹھیں۔ مانا کہ اپنی اپنی مصروفیتوں کے مطابق یہ لوگ جو بھی کرتے ہوں مگر کم از کم جب تک میں ہوں تب تک تو سب بھائی اور ان کے بچے مل جل کر کھانے بیٹھیں مگر میری چلی نہیں۔

- - - - -

ہم لوگوں کو آئے کئی دن ہو چکے تھے۔ مجھے یہ بات کچھ مناسب نظر نہیں آئی کہ تکلف میں یہ لوگ اپنا کام دھام حرج کریں۔ اس لئے میں نے ان لوگوں کو اب ہر کام معمول کے مطابق کرنے کو کہا اور خود شہر میں اپنے پرانے ساتھیوں، دوستوں اور رشتہ داروں سے ملنے اور شہر میں رونما ہونے والی ظاہری تبدیلیوں کو دیکھنے جانے لگا۔ کوئی ملتا تھا، کسی کے بارے میں پتہ چلتا تھا کہ وہ آنکھوں سے مجبور ہو گیا ہے، کسی کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا یا کوئی خود ہی سدھار چکا تھا۔ قریبی ساتھیوں یا رشتہ داروں کے یہاں میں بیوی کے ساتھ جاتا۔ اولاً تو جو نئی نسل جوان ہوئی تھی وہ جانتی تھی اور نہ ہم انہیں پہچانتے تھے۔ جو پرانے لوگ تھے وہ ملتے تو تھے مگر ان کے چہرے سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ملاقات کی تو انہیں خوشی ہے مگر میزبان بننا پسند نہیں۔ پھر بھی چائے وائے سے تو خاطر کی ہی جاتی تھی۔ مہمان داری کے سلسلے میں ایک زبردست تبدیلی یہ دیکھنے میں آئی کہ چائے پان اب بازار سے منگوایا جاتا تھا ورنہ ایک زمانہ تھا کہ بازار یا باہر سے کوئی چیز منگوا کر مہمانوں کو پیش کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مگر اب اس کا عام چلن تھا۔

اکثر و بیشتر میں اکیلا ہی نکلا کرتا تھا۔ آزادی سے کسی کے یہاں ملنے جاتا یا بازار کی سیر کرتا۔ روزہ مرہ کے استعمال کی یا تحفہ میں دی جانے والی چیزوں کے دام پوچھتا اور بمبئی کے مقابلے میں یہاں کی ارزانی پر حیرت کرتا۔ ایک آدھ چیز خرید بھی لایا کرتا تھا۔ بھائیوں کی بیویاں تامل کرتیں تو انہیں خاموش کر دیتا اور اپنی بیوی کو بتاتا کہ یہاں چیزیں کس قدر سستی ہیں۔ کم پیسوں میں بھی آرام سے رہا جا سکتا ہے۔

گھر سے نکل کر میں شہر کے مختلف راستوں اور گلیوں میں گھومتا رہتا۔ کبھی دریا کنارے یا میونسپل پارک میں بھی چلا جاتا تھا۔ سوائے اس کے کہ بعض علاقوں میں ایک آدھ نئے اور نئے ڈیزائن کے مکانات بنے تھے جو عام طور پر کسی سیاستداں، کسی سرکاری افسر یا پھر ان لوگوں کے تھے جو اس عرصہ میں بھگوان کی کرپا سے خوشحال ہو گئے تھے۔ ورنہ زیادہ تر مکانات اور سرکاری عمارتیں کائی لگی اور دھواں دھواں سی تھیں۔ تفریح گاہیں اور میونسپل پارک انتظامیہ کی بے توجہی کی منہ بولتی تصویر تھے۔ نجی یا سرکاری کسی بھی عمارت کا کوئی پرسان حال نظر نہیں آتا تھا۔ بس یوں لگتا تھا کہ اپنے شہر کو میں جس طرح اور جس حال میں برسوں پہلے چھوڑ کر گیا تھا وہیں پر یہ ٹھہر گیا تھا۔ ٹھہر بھی جاتا تو غنیمت تھی۔ یہ تو پیچھے کی طرف سفر کرتا نظر آتا تھا۔ شہر بھی اور شہر کے لوگ بھی۔

ہاں اس مخصوص چائے خانہ میں دن کے وقت جب زیادہ بھیڑ نہیں ہوتی تھی اور مجھے کبھی نوجوانوں کی وہ ٹولی نظر آجاتی تھی جو نثار نام کے اپنے کسی ساتھی کی تعریف کرتے ہوئے دکھے تھے تو میں بھی وہاں بیٹھ جاتا تھا۔ اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد ان لوگوں کو تبادلۂ خیال کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ ان نوجوان کے حسن اخلاق اور تمیزداری کے علاوہ ان کی سمجھداری اور بیدار مغزی سے میں بہت متاثر ہوتا تھا۔ لیکن یہ جان کر کس قدر افسوس ہوتا کہ اس شہر میں ان کے ہم خیالوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اتنا ہی نہیں، ان میں سے ہر نوجوان اپنے معاشرے میں ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ تاہم وہ اور نوجوانوں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش سے بھی باز نہیں آتے تھے۔

دن دوپہر کو کچھ اور نوجوان بھی وہاں آتے تھے جو شاید طالب علم تھے۔ اس لئے ہو ہاؤ کرنا اور اودھم مچانا اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے۔ ایک دن ہوا یہ کہ ہمارے چھوٹے والے بھائی بھی مجھے بیٹھا دیکھ کر وہاں آگئے تو طالب علم نظر آنے والے نوجوان سعادتمندی سے کام لیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہمارے بھائی کو "سر۔۔ سر" کر کے مخاطب کرنے لگے۔ تو یہ بات سچ نکلی کہ وہ اسٹوڈنٹس ہی تھے۔

ایک دن میں نے حساب کیا تو پتہ چلا کہ مجھے اپنے وطن آئے چھ سات دن ہو چکے ہیں۔

اور اتنے دن میں نے بالکل بیکاری اور بے شغلی میں گزارے ہیں۔ ہر وقت اور ہر دن کام میں جٹے رہنے والے کا اتنے دنوں تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا کچھ آسان نہیں تھا۔ اس لئے کچھ اکتاہٹ کا احساس ہونے لگا اور پندرہ بیس دن تک رکنے کا خیال گراں گزرنے لگا۔

ایک دن چکر لگا کر شام ہوتے ہوتے میں گھر پہونچا تو مغرب کا وقت ہونے کو تھا اور نمازی مسجد میں آنے لگے تھے۔ ہمارے بعد والے بھائی نے کہا۔

"کبھی کبھار مسجد بھی چلے جایا کیجئے۔ ہر آدمی یہ دیکھتا ہے کہ کون آیا کون نہیں آیا۔"

چھوٹی جگہوں پر واقعی ایسا ہوتا ہے اس لئے میں نے ہامی بھری۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ کل جمعہ کی نماز میں جاؤں گا۔"

جمعہ کی نماز کے بعد ان لوگوں سے بھی ملاقات ہوئی جو پہلے مل چکے تھے اور ان سے بھی ملنا ہوا جن سے اس وقت تک ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ان لوگوں سے بات چیت ہو رہی تھی کہ ایک نوجوان جس کا سر گھٹا، داڑھی بے تکان بڑھی اور پائجامہ اونگ تھا میرے قریب آکر ایک انتہائی بے تکا سا سوال داغ دیا۔

"چچا، آپ یہاں کیسے؟"

میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے اور کس کا لڑکا ہے لیکن جب اس نے چچا کہہ کر مخاطب کیا تھا تو میں نے بھی بزرگانہ انداز سے کہا۔

"ہاں بیٹے ! بہت دن ہو گئے تھے اس لئے آپ لوگوں سے ملنے اپنے وطن چلا آیا۔"

"نہیں۔۔۔ یہ میں نہیں پوچھ رہا ہوں۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ آپ مسجد کی طرف کیسے نکل آئے؟"

"واہ۔۔ آخر میں بھی مسلمان ہوں۔۔۔ مسجد میں آنے کا مجھے بھی حق ہے بھائی۔"

"حق۔۔۔ حق کاہے کا صاحب۔۔۔ آپ جیسے مسلمان نہ ہوں تو اچھا ہے۔"

میں نے اس لڑکے کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور منہ سے جھاگ اڑنے لگا تھا۔ اس کے اس قدر جوش میں آنے کا سبب میری سمجھ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں آیا کہ مذہب یا کسی عقیدے سے آدمی جذباتی طور پر وابستہ ہو کر غلو میں پڑ جاتا ہے تو اس کی کیفیت وہی ہوتی ہے جو اس لڑکے کی ہے۔ ایسے لوگوں سے بحث کرنا فضول ہوتا ہے۔ میں نے وہاں سے ہٹنا چاہا تو وہ میرا پیچھا بھی نہیں چھوڑ رہا تھا۔ میرے لئے اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ باقی تمام

لوگ دم سادھے کھڑے تھے اور کوئی اسے روک نہیں رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہمارے بھائی بھی۔

گھر میں آنے کے بعد میں نے پوچھا۔

"اس لڑکے کے دماغ میں کچھ خلل تو نہیں ہے۔"

اس کے تقویٰ اور جوش ایمانی کی تعریف کرتے ہوئے ہمارے بعد والے بھائی نے کہا۔

"اس قسم کے جوشیلے بچوں کی ضرورت ہے۔"

"نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔۔۔ دیوانگی اور جوش میں فرق ہے۔ جوش کے ساتھ ہوش اور عقل بھی چاہئے تاکہ آدمی اعتدال میں رہے نہ کہ کسی سے بھی بھڑ جائے۔ جس طرح دعا سلام کے بغیر مجھ سے وہ بھڑ گیا۔

"اس کا سبب ہے۔ خلیفہ باغ کی مسجد جب بن رہی تھی تو لوگ چندے کے لئے کلکتہ اور دلی کے علاوہ بمبئی بھی گئے تھے اور وہاں آپ نے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ میں مسجد بنوانے کے لئے کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

"یہاں کا کوئی آدمی بھی مجھ سے بمبئی میں نہیں ملا تھا۔"

"نہیں ملا تھا۔ تو پھر یہ بات یہاں کیسے پھیلی جس پر اس لڑکے نے آپ سے اپنی خفگی کا اظہار کیا؟۔ میں اسے سمجھاؤں گا۔"

اپنے بھائی سے تو میں نے کچھ نہیں کہا البتہ یہ سوچنے لگا کہ جوش اور وہ بھی اس قسم کے بے جا جوش میں بھرے لوگوں کو کون سمجھا سکتا ہے۔ ہاں انہیں سلگایا ضرور جا سکتا ہے۔ اس قسم کے لوگ مذہب کا دامن تھام کر سماج میں عزت کا مقام حاصل کر رہے ہیں۔ مگر اپنے ملک کا ماحول ایسا ہوتا جا رہا ہے کہ غنڈے اور اوباش بھی ہمارے محافظ سمجھے جانے لگے ہیں۔

اپنے طور پر میں نے یہ جتانے کی ضرور کوشش کی کہ اس واقعہ کا میں نے کچھ برا نہیں منایا ہے۔ مگر یہ بات تو اپنی جگہ صحیح تھی کہ اس لونڈے نے مجھ سے الجھنے کی کوشش کی تھی اور یہ واقعہ ہمارے لئے خفت کا باعث بنا تھا۔ اپنی خفت کو مٹانے کے لئے یونہی ٹہلتا ہوا میں آم کے باغ میں پہونچ گیا۔ وہاں نظر اٹھا اٹھا کر میں ہر پیڑ کو دیکھنے لگا۔ بور کا موسم گزر چکا تھا مگر آموں کی فصل کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ البتہ ان پتنگوں کی ضرور بھیڑ تھی جو اس موسم میں آموں کے پیڑ پر پتہ نہیں کہاں سے آکر جمع ہو جاتے ہیں اور پاس گزرنے والے پر یلغار کرتے ہیں۔

کہیں سے خالق بھائی کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ وہ لپکتے ہوئے وہاں آئے اور بہت تشویش کے

ساتھ پوچھنے لگے۔

"بات کیا ہوئی۔۔وہ بے ہودہ چھو کرا تم سے کیوں الجھ رہا تھا؟"

"الجھ نہیں رہا تھا۔ بس جوش میں تھا۔"

"جوش ووش میں خاک نہیں تھا۔وہ تم سے گستاخی کرنا چاہتا تھا۔"

"کیوں بھلا؟"

"وہ بھی ایک پٹھا ہے تمہارے بھائی کا۔"

"پھر"

"تمہیں ابھی یقین نہیں آئے گا۔ لیکن تمہیں آگاہ کر دینا ہمارا فرض ہے۔ تم نے یہاں مکان بنوانے کا جو خیال ظاہر کیا ہے تو وہ بات انہیں پسند نہیں ہے۔"

میں چپ رہا۔

"تم نے کہیں ان لوگوں سے کہہ تو نہیں دیا کہ ہم مکان کے لئے تمہیں زمین دینا چاہتے ہیں؟"

"کہا تو ہے۔"

"بس۔۔۔ بس سمجھ میں آگئی ساری بات۔ تمہارے خلاف آج ایک کو لگایا ہے کل دوسروں کو لگائیں گے۔"

"مگر کیوں بھلا؟"

تاکہ تم یہاں آنے کا خیال ترک کر دو۔ یہاں آکر باغ باغیچہ اور موروثی جائداد میں کہیں اپنا حصہ نہ مانگو۔اس لئے وہ نہیں چاہتے کہ تم یہاں آؤ۔"

پتہ نہیں اس بات میں کتنا دم تھا اور کتنا نہیں تھا۔ مگر اس قسم کی باتوں کا انکشاف ہی دل کا خون کرنے کے لئے کافی تھا۔ایک عجیب سی اداسی نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

رات کے کھانے کے بعد ہمارے چھوٹے بھائی دھیرے دھیرے اور کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ دالان سے اٹھ کر کمرے میں جا کر بیٹھے اور سلسلہ کلام جاری رکھا۔ پھر اپنی بیوی کو بلا کر بڑی آہستگی سے کہا کہ دو پیالی چائے بناؤ۔ بمبئی میں رہنے والوں کو تو خیر کسی وقت بھی چائے چلتی ہے مگر یہاں رات کے وقت چائے پینا بالکل غیر معمولی بات تھی۔ مجھے لگا کہ دن کے

واقعہ کے بعد وہ شاید ہماری دل جوئی کے خیال سے یہ خاطر کر رہے ہیں۔

چائے پیتے ہوئے وہ بمبئی کی زندگی، ہم لوگوں کے رہن سہن اور مکان وغیرہ کے متعلق وہ باتیں پوچھتے رہے جن کو پوچھنے کا اب سے پہلے کوئی موقع نہیں آیا تھا۔ لگے ہاتھوں انہوں نے مکان کی قیمت بھی معلوم کرنا چاہی اور ہماری بیوی کے حوالے سے یہ سوال کیا۔

''کیا واقعی آپ کے بمبئی والے مکان کی قیمت پندرہ سولہ لاکھ ہوگی؟''

''اتنی قیمت کا ہے تو نہیں مگر ہم جس ایریا میں ہیں وہاں مکان کی مانگ بڑھی ہے اس لئے اب شاید اتنے دام کا ہو گیا ہو۔''

یہ سن کر انہیں بڑی خوشی ہوئی اور انہوں نے کہا۔

''اسے آپ بیچ دیں تو یہاں آپ کوٹھی بنوا سکتے ہیں کوٹھی۔''

''وہاں کا مکان بیچ کیسے دوں؟ مانا کہ میں یہاں چلا آؤں گا لیکن ہمارے بچوں کے لئے وہاں رہنے کی کوئی جگہ تو چاہئے ہی چاہئے۔''

''اچھا۔۔۔اچھا۔''

اور بچے ایک نہیں دو ہیں۔ دونوں بھائیوں کی رہائش کا انتظام بھی تو مجھے ہی کرنا ہوگا۔

''وہ کس طرح؟''

''اس مکان کو بیچ کر دور دراز کے علاقہ میں جہاں مکان کی قیمت کم ہے دونوں کو الگ فلیٹ خرید دوں گا۔ اور۔۔۔ اور انہیں کیا بتاتا کہ دور دراز کے علاقوں میں مکان کم دام پر مل بھی جاتا ہے تو وہاں سے روز سفر کرنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود لوگ جان پر کھیل کر روز سفر کرتے ہیں۔''

''پھر یہاں آجائیں گے۔۔۔ اپنا مکان بنوانے؟''

''سوچتا تو ہوں مگر فوراً نہیں''

''کیوں؟''

''دو تین سال ریٹائرمنٹ کو ہیں۔ جب تک دوسرا اولا بھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا اور جو جمع جتھا نکلے گا اسے لے کر میں یہاں آجاؤں گا۔۔۔ اور پھر خدا نے چاہا تو تم لوگوں کی مدد سے اور اپنی نگرانی میں چھوٹا موٹا سا کوئی مکان بنوا لوں گا۔''

"دو تین سال بعد۔۔۔؟"

ان کے لہجہ میں مایوسی تھی۔ شاید ہمارے جلد نہیں آنے کی وجہ سے۔

اس کے بعد ہم لوگ سونے سلانے چلے گئے۔

دوسرے یا تیسرے دن اپنے ایک رشتہ دار سے ملنے نکلے تو ہم نے اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے لیا۔ کچھ دور تک پیدل چلنے کے بعد رکشہ ملا تو پھر ریلوے کا پھاٹک بند ملا۔ لوکل شٹل کے گزر جانے پر پھاٹک کے کھلتے ہی دونوں طرف کی سواریاں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کے مقابلے میں ایک دوسرے کا راستہ کھوٹا کر کے اٹکی رہیں۔ اور جلدی کے بجائے اور وقت لیا۔

کسی صورت ہمارا رکشہ لائن کے اس پار گیا تو اس مخصوص سڑک کی ہوٹل پر کچھ نوجوان بیٹھے نظر آئے۔ ایک شخص کو اٹھ کر فوراً سائیکل پر جاتے دیکھا تو کیوں شبہ ہوا کہ ہمارے چھوٹے بھائی تھے۔ اس ہوٹل کے قریب پہونچا تو دیکھا کہ وہاں وہی نوجوان تھے جو ہمارے چھوٹے بھائی کے شاگرد تھے اور انہیں "سر۔۔۔ سر" کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ بیوی ساتھ تھیں اس لئے وہاں رکنے یا بیٹھنے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ تاہم اس طرف دیکھتا ضرور گیا۔

جب کچھ آگے نکل گیا تو وہی نوجوان سائیکلوں پر بگٹٹ ہمارے قریب آئے اور قریب آنے سے پہلے وہ لوگ۔ "سنئے مہاشئے" کی ہانک لگا رہے تھے۔ میں نے رکشے والے کو رکنے کو کہا۔

وہ چار پانچ تھے۔ ہمارے گرد اس طرح کھڑے ہو گئے جیسے محاصرہ کر رہے ہوں۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"دیکھئے! آپ ہمارے سر کے بھائی ہیں اس لئے پہلے آپ کو سمجھا دیتے ہیں۔"

ان کے تیور دیکھ کر مجھے کچھ تشویش ہوئی۔ میں نے پوچھا۔

"بات کیا ہوئی۔ یہ بھی تو بتاؤ۔"

"بہت گمبھیر بات ہے۔ روز ہم لوگ دیکھتے ہیں کہ آپ ان بدمعاشوں سے بہت میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں۔"

"کن بدمعاشوں سے؟"

"ارے وہی ادھر کی لوگ اور کون؟"

"کن کے بارے میں کہہ رہے ہو؟ میں سمجھا نہیں۔"

"دیکھئے اتنے بھولے نہیں بنئے۔ وہی لچے لوگ جن سے آپ دھرم کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔"

تھے تو آخر کو وہ ناتجربہ کار طالب علم ہی اس لئے میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تو ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر رکشے کے پائدان پر اپنا پاؤں رکھ دیا اور پتلون کا پائنچہ اوپر سرکا کر وہ کٹہ دکھادیا جو اس کی پنڈلی پر بندھا تھا۔ وہ بڑے غضبناک لہجہ میں کہنے لگا۔

"دیکھئے۔۔۔ ہم کو فالتو دلیل نہیں دیجئے۔ ان لوگوں کو ہم لوگ دیکھنا نہیں چاہتے۔ موقع ملنے کی دیر ہے۔ کسی دن بھون دئے جائیں گے۔ جو ان سے سہانو بھوتی رکھے گا اسے بھی نہیں چھوڑیں گے۔ باقی آپ سمجھئے اور آپ کا کام۔"

اتنا کہہ کر وہ لوگ چلے گئے۔ مجھ پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ کبھی یہ خیال آتا تھا کہ اپنے بھائی سے پوچھوں گا کہ تمہارے اسٹوڈینٹس کو کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی۔ پھر یہ خیال آیا کہ۔ "خالق بھائی نے ان لوگوں کے بدقماش پٹھوں کی جو بات کہی ہے وہ صحیح تو نہیں۔ بیوی کے ایک آدھ جملے سے اس خیال کو تقویت ملی۔ انہوں نے کہا کہ یہ آپ گھر ور بنوانے کی کیا بات کرنے لگے ہیں؟ آپ کے بھائیوں کو یہ پسند نہیں۔ خالق بھائی نے زمین دینے کی جو بات کہی ہے اس پر یہ دونوں بھائی اور چراغ پا ہو رہے ہیں۔

- - - - -

میں نے بیوی کے تھوڑے کہے کو بہت سمجھا اور رکشہ والے کو لوٹ کر اسٹیشن چلنے کو کہا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ بمبئی کا ٹکٹ جتنی جلد ملے گا لے کر واپس چلا جاؤں گا۔ اتفاق کی بات کہ وہاں ہمارے ایک پرانے ساتھی مل گئے۔ ان کو تو میں نہیں پہچان سکا مگر وہ دیکھتے ہی پہچان گئے اور سارے حالات پوچھنے اور بتانے کے بعد اسٹیشن تک آنے کا ہمارا مقصد دریافت کیا۔

"میں نے ان سے کہا کہ ہمارا بمبئی فوراً لوٹنا ضروری ہے اس لئے کل یا پرسوں کی گاڑی سے دو ریزروڈ برتھ چاہئیں۔"

اس بیچارے نے بہت اندر باہر کرنے کے بعد بڑی لجاجت سے کہا۔

"کل کی گاڑی میں دو تو نہیں ایک برتھ مل سکتا ہے مگر اس کے لئے سو روپیہ اکسٹرا لگے گا۔"

بھاگتے چور کی لنگوٹی کے مصداق میں نے ہامی بھر لی۔

بیوی کا دل بھی اپنے لڑکوں میں لگا ہوا تھا اس لئے فوراً بمبئی واپس ہو جانے کی تجویز سے انہوں نے پورا اتفاق کیا۔ گھر پہونچ کر میں نے بتایا کہ آج بمبئی فون کیا تھا۔ وہاں کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ

میرا فوراً واپس جانا نہایت ضروری ہے۔ ضروری تھا تو کسی نے کوئی تکلف یا اعتراض بھی نہیں کیا۔

- - - - -

جس بڑے اسٹیشن سے بمبئی کی ٹرین نو بجے صبح کو ملتی تھی وہاں تک پہونچانے والی لوکل ٹرین مجھے آٹھ بجے لینی تھی۔ مگر میں علی الصباح ہی تیار ہو گیا۔ تیاری بھی کیا کرنی تھی۔ ایک سفری بیگ اور ایک سوٹ کیس۔ اتنی ہی سی تیاری کے لئے میں ساری رات جاگتا اور کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ جاگ شاید ہماری بیوی بھی رہی تھیں۔ صبح ہونے پر جب دوسرے لوگ بھی جگے تو جھٹ پٹ چائے ناشتہ بنانے میں لگ گئے۔ کھانے پینے کا تعلق بھی ذہنی کیفیت سے ہوتا ہے اور ہمارا ذہن اس قدر بوجھل اور پراگندہ تھا کہ کھاتے نہیں بنا۔ بس منہ جھوٹا کیا اور پھر اسٹیشن کے لئے چل پڑے۔ چلتے چلتے ہماری بیوی نے بچوں میں کچھ پیسے تقسیم کئے اور پھر ملنے کا رسمی جملہ ادا کرنے کے بعد رکشہ پر بیٹھنے باہر نکلیں۔

اسٹیشن تک چھوڑنے ہمارے دونوں بھائی اور ان کے چند بچے آئے تھے۔ گاڑی کے آنے سے پہلے میں نے بچوں کو پیار کیا اور بمبئی آنے کی دعوت دی۔ ہمارے بھائیوں نے ہم لوگوں سے پھر آنے کو کہا۔ لیکن میں کب آتا۔۔۔ آتا بھی یا نہیں اس کے متعلق کچھ کہنا مشکل تھا۔ آنے جانے کی بات تو دور رہی ان لوگوں سے پھر ملاقات بھی ہو گی یا نہیں اس کی بھی خبر نہیں تھی۔

گاڑی پر سوار ہونے سے پہلے میں نے دونوں بھائیوں سے بالکل ٹھنڈے، پالا مارے ہاتھوں سے مصافحہ کیا۔ ان دونوں نے رخصتی سلام کیا اور ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہا۔ شاید ہمیشہ کے لئے۔

بڑے اسٹیشن پر اترتے ہی مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ خالق بھائی لپکتے جھپکتے آتے دکھے۔ وہ لوکل گاڑی کے کسی اور ڈبے میں سوار ہو کر ہم لوگوں کو بمبئی والی گاڑی پر سوار کرانے کا ارادہ کر کے آئے تھے۔ مجھ پر اس کا بڑا اثر ہوا۔ ابھی اس کیفیت سے نکلا بھی نہیں تھا کہ انہوں نے میری بیوی کی طرف ایک پوٹلی بڑھائی جس میں راستہ کے لئے کھانے پینے کا کچھ سامان تھا۔

بمبئی کی گاڑی ایک گھنٹہ تاخیر سے آ رہی تھی۔ یہ وقت میں نے پلیٹ فارم پر چہل قدمی کر کے اور خالق بھائی سے باتیں کر کے گزارا۔ وہ برابر اصرار کر رہے تھے کہ جب بھی ہو اپنے وطن لوٹ آؤ۔ عمر کے آخری ایام میں اپنے وطن لوٹنے کی تمنا تو ہمارے دل میں بھی بے حد تھی۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ زندگی کی سختیاں اور صعوبتیں تو آدمی کسی طرح جھیل

لیتا ہے اور اس معاملہ میں وہ اکیلا نہیں ہوتا۔ ایک انبوہ ہوتا ہے۔ مگر بمبئی میں مجھے مرنا پسند نہیں۔ اس معاملہ میں میں بہت سنجیدہ ہوں۔ مگر اپنے خیالات کو جس طرح ظاہر کرتا ہوں اسے لوگ مذاق سمجھ کر ہنس دیا کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ ہنسنے کا موقع نہیں ہوتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب میں یہ کہتا کہ بمبئی میں تو لوگ قبر میں بھی آرام نہیں کرنے دیتے۔ چھ آٹھ مہینے بعد ہی کسی اور کو دفن کرنے کے لئے پہلے مردے کو ڈسٹرب کر دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف وطن میں یا بمبئی سے باہر آدمی قبر میں لیتا ہے تو قیامت سے پہلے اٹھنے یا کسی کے ڈسٹرب کرنے کا سوال نہیں اٹھتا۔ یہ حقیقت ہے۔ پھر اس پر ہنسنے کا کیا تک؟

بڑے انتظار کے بعد بمبئی کی گاڑی آئی۔ سی فور میں اپنے ۳۲ نمبر برتھ کو تلاش کر کے ہم دونوں میاں بیوی بیٹھ گئے۔ خالق بھائی نے بھی مدد کی۔ گاڑی کے چھوٹنے سے پہلے یہ کہتے ہوئے کہ۔ "ذرا ہماری لڑکیوں کی شادی کا بھی خیال رکھو گے۔" نیچے اتر گئے۔

اس وقت ڈبے میں اتنے ہی مسافر تھے جتنے کی گنجائش تھی۔ گھنٹہ بھر لیٹ ہونے پر بھی جب یہ چلی تو مجھے ایک عجیب سا اطمینان ہوا۔ کیسا اطمینان تھا یہ بتانا مشکل تھا۔ جبکہ دل پر ایک بوجھ بھی تھا۔ میں کھڑکی سے باہر ٹکٹکی لگائے تیزی سے گزرتے بجلی کے کھمبوں، پیڑ پودوں اور دور نیلی دھند میں لپٹی پہاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ باہر سے آنے والی قدرتی ہوا کے جھونکے تھپکیاں دے رہے تھے۔ رات آنکھوں میں کٹی تھی اس لئے غنودگی طاری ہونے لگی۔ پشت سے سر ٹکائے میں جھپکی لینے لگا۔

لیکن جب اسٹیشنوں پر گاڑی رکتی تھی اور نئے مسافروں کا غول آتا تھا تو خلل پڑتا تھا۔ آنے والوں کو کوئی روک بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ سب مقامی لوگ تھے جن کی دھونس ہوتی ہے۔ اوپر سے دن کے وقت ریزرویشن ویزرویشن جیسی کوئی چیز نہیں ہوتی۔

جو بھی ہو گاڑی بڑھتی جارہی تھی اور ہم لوگ اپنے وطن سے دور اور بمبئی سے قریب ہوتے جارہے تھے۔ اسی بمبئی سے جہاں روزگار کی تلاش میں آنے والوں کی ایک بھیڑ لگی ہوئی ہے اور یہ لوگ کنکریٹ اور خستہ حال جھوپڑوں میں ناکافی روشنی اور پانی کے بغیر زندگی گزارنے اور ٹھسا ٹھس بھری لوکل ٹرینوں میں انتہائی تکلیف دہ سفر کرنے پر مجبور ہیں۔ زندہ رہنے کے لئے کوئی ان تکلیفوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ احساس کی کمی بہت ساری تکلیفوں سے نجات دلادیتی ہے۔ اپنا بھی یہی حال تھا مگر یہ کہے بغیر بھی نہیں رہتا تھا کہ۔ "بمبئی دل سے تو پسند نہیں، ہاں پیٹ سے ضرور پسند ہے۔"

مختصر یہ کہ ہر لمحہ یہ گاڑی مجھے بمبئی کے قریب اور وطن سے دور لئے چلی جارہی

تھی۔ کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا تھا کہ وہ کون لوگ تھے جنہیں پردیس کے عیش و آرام سے زیادہ وطن کے دکھ درد پسند تھے۔ باہر کے گلستاں کے معاملہ میں وطن کا کانٹا اچھا تھا۔ مجھے تو یہ کانٹا چبھ گیا تھا۔ پھر بھی خالق بھائی کے دئے ہوئے توشہ سے کچھ کھا پی کر ہم لوگ اپنا وقت گزار رہے تھے کہ مصیبت بن کر ٹی ٹی آ گیا۔ اس سے جان بچی تو پھر ایک ہی برتھ پر رات گزاری اور جلد سے جلد ممبئی پہونچنے کی دعائیں کرتا رہا۔

مگر بمبئی جلد کسی طرح پہونچتے۔ اسٹیشنوں کے علاوہ بے شمار جگہوں پر زنجیر کھینچ کر ٹرین کو اتنی بار روکا گیا تھا کہ ایک تو پہلے ہی ایک گھنٹہ لیٹ تھی اور اب پتہ چلا کہ پانچ گھنٹے لیٹ ہو چکی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس گاڑی کو اگر نو بجے رات میں بمبئی پہنچنا تھا تو اب دو بجے رات کو پہونچے گی بشرطیکہ اس کے راستے میں اور روڑے نہیں اٹکائے گئے۔

خدا خدا کر کے یہ گاڑی اپنی منزل پر پہنچی تو وقت دو سے زیادہ ہو چکا تھا۔ ہم لوگ دادر ہی پر اتر گئے۔ یہاں سے ٹیکسی سستی پڑتی۔ سستی تو خیر نہیں پڑتی کیونکہ نائٹ چارج کے علاوہ بھی ڈرائیور ایسی ترکیب کرتے ہیں کہ کرایہ دوگنا سے زیادہ ہو جائے۔ اتنا لمبا سفر کر کے ویسے بھی فضول خرچ میں پڑ چکا تھا اس لئے بیوی سے کہا۔

"اتنا جھیلے تو تھوڑی مصیبت اور سہی۔ پیدل پُل پر چل کر ویسٹرن ریلوے کے پلیٹ فارم پر چلتے ہیں۔ وہاں کچھ دیر انتظار کریں گے اور پھر پہلی یا دوسری لوکل پکڑ کر گھر چلیں گے"

بیوی نے بھی رضامندی ظاہر کر دی۔ اس وقت قلی ولی کے ملنے کی امید تو نہیں تھی پھر بھی میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو سامنے ہی ہڈی چمڑے کا بنا ہوا ایک آدمی کھڑا ملا۔ اس نے اپنی خدمات پیش کیں تو مول بھاؤ کر کے اسے اپنا مختصر سا سامان اٹھانے اور بہت تیز نہیں چلنے کی ہدایت کر کے ہم لوگ سنٹرل سے ویسٹرن ریلوے کے پلیٹ فارم نمبر ایک کی طرف چلے جہاں سے پہلی یا دوسری لوکل ٹرین ملتی۔

اتفاق سے ایک بینچ خالی تھا جس کے سامنے قلی نے ہمارا سامان رکھا اور بینچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ خود کھڑا رہا۔ طلب مجھے بھی تھی اس لئے اس سے چائے پینے کو کہا تو وہ اسٹال کی طرف بڑھا۔ میں نے اسے روک کر کہا۔

"ایک فروٹی اور دو چائے لاؤ۔ اور سنو تم کچھ کھانا چاہو تو اپنے لئے وہ بھی لے لو۔ وہ پہلے فروٹی اور ایک چائے لے آیا۔ بعد میں اپنے لئے بچا کھچا وڑہ اور چائے۔ ٹھنڈا اور باسی وڑہ جس رغبت سے وہ کھا رہا تھا اس سے صاف پتہ چلا کہ وہ بھوکا تھا۔ قاعدے سے اسے ہمیں لوکل ٹرین پر سوار کرانا

تھا۔ مگر میں نے اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کی اجرت دیتے ہوئے اسے جانے کو کہا تو وہ راضی نہیں ہوا۔ کہنے لگا۔

''نہیں صاحب! ابھی کوئی اور گاڑی نہیں ہے اس لئے میں بیٹھتا ہوں۔''

''مگر یہ لائسنس والے قلی تمہیں گھسنے کیسے دیتے ہیں؟''

''لوکل ٹرین پر یا کوئی گاڑی جب بہت دیر سے آتی ہے یا ایس ٹی ڈپو میں ہم لوگ گھس پینٹھ کر لیتے ہیں۔''

''کتنی آمدنی ہو جاتی ہے؟''

''کھانے پینے بھر ہو جاتی ہے۔''

''بال بچے کہاں ہیں؟''

''یہیں بمبئ میں۔۔۔ وہ لوگ بھی کچھ نہ کچھ کرتے ہیں تب کھانے بھر ہو جاتا ہے۔''

''رہنے والے کہاں کے ہو؟''

''گلبرگہ کے۔''

''وہاں ہے کوئی؟''

''ہاں سب ہی ہیں۔ بھائی لوگ ہیں۔۔۔ بہن بھی ہے۔''

''جاتے ہو گلبرگہ یا نہیں؟''

''کیا جائیں گے صاحب! سب کو تو اپنی پڑی ہے۔ ایک باری گیا تھا بہت شوق سے مگر ایسا لگا کہ ہم لوگ ان سب پر بوجھ ہیں۔ کسی کو خوشی نہیں تھی ہم لوگوں کے جانے کی۔ جب کوئی خوش ہی نہیں ہوتا تو کیا فائدہ پیسہ خرچ کر کے جانے کا؟ بہت مشکل سے پیسہ ہاتھ لگتا ہے صاحب۔۔۔ بہت محنت کرنے پر ملتا ہے۔''

مجھے بالکل ایسا لگا کہ یہ جاہل، گنوار اور زمانہ کا مارا ہوا چرخ سا قلی اپنی بپتا نہیں سنا رہا تھا بلکہ ہماری بات۔۔۔ ہمارے دل کی بات کہہ رہا تھا۔

میں نے چور نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کئے بیٹھی تھیں۔ اونگھ رہی تھیں یا ایسے ہی آنکھیں موندے ہوئے تھیں۔ لیکن ہمارے خیالات کو تو جیسے پر لگ گئے۔ شروع سے آخر تک ساری باتیں نظروں کے سامنے پھرنے لگیں۔ واقعی کتنے شوق سے ہم لوگ بھی گئے

تھے اور کیسا احساس لے کر لوٹے ہیں۔ اپنے بچوں کو کیا بتائیں گے۔۔۔۔ ان کی جڑ کہاں ہے اور کیسی ہے۔۔۔ کیسی ہے؟

یہی سب سوچتے سوچتے بے خیالی میں گنگنانے لگا تو بیوی نے چونک کر پوچھا یہ صبح صبح گا کیا رہے ہو؟ میں جو گا رہا تھا وہ گاتا ہی گیا۔

جینا یہاں

مرنا یہاں

بیوی نے بالکل بے خیالی میں سوال کیا۔

"کہاں؟"

کہیں بہت دور سے ہماری آواز آئی۔

"بن باس میں۔"

مصنف کی دوسری تخلیقات

طباعت کے مختلف مرحلوں میں

(۱)	کہاں ہے تیری منزل	طویل افسانوں کا مجموعہ
(۲)	موش کل	ناول
(۳)	زنجیریں	//
(۴)	ہابیل کی شکست	//
(۵)	اہم لوگ	اہم شخصیتوں کے خاکے
(۶)	غضب لوگ	عجیب و غریب شخصیتوں کے خاکے
(۷)	مانش گودام	فل لنتھ ڈرامہ

Doosri Makhlooq

(Urdu Stories)

MAHMOOD AYUBI

Price : Rs. 150/-

November 1998

Printed at : New Age Printing Press, Prabhadevi, Mumbai - 25